ریزہ ریزہ چاندنی

(سماجی، معاشرتی، و اصلاحی افسانے)

محمد انیس فاروقی

Ph.(p.p) : 254269.

حقوق ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ بحق مصنف محفوظ

نام کتاب ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ریزہ ریزہ چاندنی

سنہ اشاعت ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۱۹۹۴ء

پہلا ایڈیشن ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ پانچ سو

سرورق ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ محمدؐ غوث

طباعت ـ ـ ـ ـ اسپیڈ پرنٹس، سعید آباد، حیدرآباد فون 873538

ناشر ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ مصنف

مالی اعانت ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش، حیدرآباد

قیمت ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ پچاس روپیے (Rs. 50/-)

ملنے کا پتہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ "نور جبیں" مکان نمبر ۸۲/۶۱ - ۴ - ۹

معراج کالونی، ٹولی چوکی حیدرآباد - ۸

۲ - ہمالیہ بک ڈپو، ۵۶۱ - ۷ - ۵، نامپلی بازار،

درگاہ یوسفین روڈ حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۱

(برانچ) نمبر ۲، منور نجن کامپلکس، اجنتا گیٹ،

مکرم جاہی روڈ، حیدرآباد -

Acc. No
380

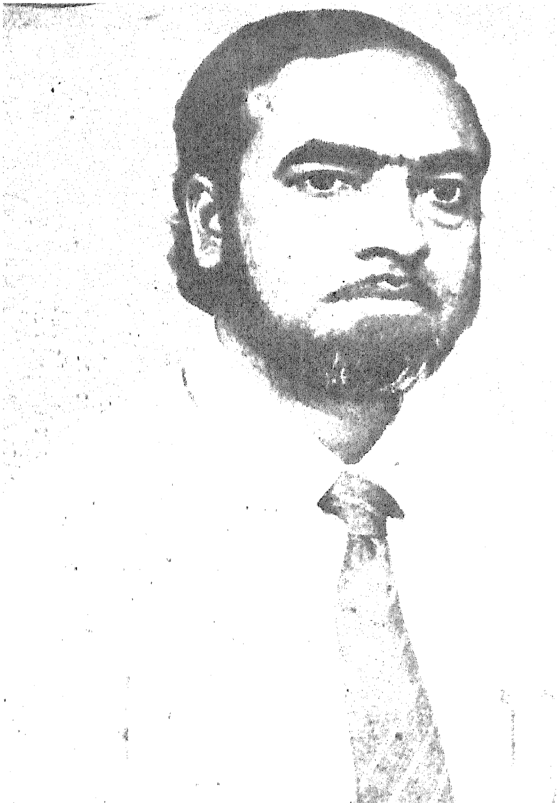

انتساب

والدہ ماجدہ کے نام

جن کی محنت کش زندگی نے مجھے
وہ احساس بخشا کہ میں افسانہ نگار بن گیا۔

محمد انیس فاروقی

فہرست

۱۔ انیس کہانی (تعارف) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱
۲۔ اپنی بات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵
۳۔ آزاد مملکت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸
۴۔ کھوئی ہوئی منزل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱
۵۔ گونگے آئینے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵
۶۔ نوید سحر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱
۷۔ منزل کے نشاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۵
۸۔ پرائی خوشبو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴
۹۔ ریزہ ریزہ چاندنی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۲
۱۰۔ تیرے بنا بھی کیا جینا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹
۱۱۔ انعام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۳
۱۲۔ بہاروں کا موسم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۲

انیس کہانی

کہانی کیا ہے ۔؟اس بارے میں مختلف زبانوں کے ادبی نقادوں نے بہت سی باتیں کہی ہیں ۔ میرے خیال میں بیتے ہوئے لمحوں کے بارے میں کہی گئی دلچسپ باتیں جو بڑے اشتیاق اور انہماک سے سنی جاتی ہیں یہی کہانیوں کی بنیاد بنتی ہیں چاہے یہ باتیں کسی کی آپ بیتی ہوں یا جگ بیتی ۔ جب سننے والوں کا اشتیاق بڑھا تو کہنے والوں نے بھی حقیقتوں کو افسانوں میں بدلنا شروع کر دیا اور اگر بات طول پکڑ گئی تو داستان کہلائی ۔ کردار حقیقی دنیا سے لئے گئے ، واقعات ترتیب سے بیان ہونے لگے جن میں تحیر اور تجسس کا عنصر بھی شامل ہو گیا تو انہیں طویل افسانہ یا ناول کہا گیا ۔ اور یہ ادب کی مستقل صنف بن گئی ۔ کہانیوں کی بھی ایک کہانی ہے ۔ عظیم کہانی ۔ دنیا کی سب سے قدیم کہانی سب سے پہلے خالق کائنات نے صرف ایک لفظ میں کہی اور وہ لفظ تھا " کن " ۔ ہو جا ۔ اور کہانی شروع ہو گئی ۔ " فیکون " ازل سے ابد تک اور پھر اس سے بھی پرے ۔ شیکسپیئر کے الفاظ میں ہم سب اس عظیم کہانی کے کردار ہی تو ہیں !

انسان کی زندگی کے تین ادوار ہوتے ہیں ۔ بچپن ، جوانی بڑھاپا ۔ بچپن کے لئے بچوں کی عمر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کہانیاں لکھی جاتی ہیں جس میں اخلاق آموز اور دل بہلانے والا عنصر نمایاں رہتا ہے ۔ پختہ سن کو پہنچ جانے کے بعد انسان کے اپنے معاشی اور معاشرتی مسائل ہوتے ہیں ۔ سماج اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے ۔ زندگی کے بارے میں انفرادی رویہ یکجا ہو کر سماج کے ڈھرے کی تشکیل کرتا ہے ۔ روایتیں جنم لیتی ہیں جن سے انحراف یا پھر بغاوت نت نئے مسائل کو جنم دیتی ہے ۔

انیس فاروقی نے کہانیاں کہنے کے لئے درمیانی کڑی کا انتخاب کیا ہے ۔ یہ عمر

کھلنڈرے پن سے سنجیدگی کا سفر بنتی ہے تو محبت۔ شادی۔ تعلیم، دوستی قرابت داروں کی نگاہوں میں اپنی شخصیت کا تعین، معاشرتی زندگی کے آداب کی تربیت، رکھ رکھاؤ، برے بھلے کی پہچان کی ابتداء، معصوم جذبے، کچھ بننے کی خواہش، اپنی آرزوں اور امنگوں کی تکمیل کے لئے ضد اور ماحول سے روایتوں سے ٹکراؤ۔ کچی عمر کے کچے جذبے رومان پرور فضاؤں میں جنم لیتے ہیں اور زمانے کے سرد گرم تھپیڑوں کی زد میں آکر اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔ پرشباب آنکھوں میں مسرت اور سرور کی جگہ نمی تیرنے لگتی ہے۔ انیس فاروقی کی اکثر کہانیوں کے تانے بانے ایسی ہی فضاء میں بنے گئے ہیں۔ ان کے کردار زندگی کی ہمک سے بھرپور ہوتے ہیں۔ کہانیوں کی فضاء رومان پرور فضاؤں سے اٹھتی ہے۔ آنکھوں میں رنگین خواب جنم لیتے ہیں پھر اڑتے ہوئے لمحے حقائق کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر زخمی ہوجاتے ہیں۔ ان زخموں سے لہو رستا ہے پھر وقت مرہم بن جاتا ہے۔ مدوجزر کے بعد گہری جھیل کے مسطح پانی کا سا سکون۔!

انیس فاروقی کی بیشتر کہانیوں کے کردار جیتے جاگتے کردار ہیں۔ میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ انیس فاروقی نے ایک دو کہانیوں کو چھوڑ کر اکثر سچے واقعات ہی کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بنایا ہے۔ اپنے دوستوں عزیزوں قرابت داروں اور شناساؤں کی زندگیوں میں آئے ڈرامائی واقعات نے ان کی توجہ جب جب کھینچ لی انہوں نے قلم اٹھایا اور اسے کہانی کا روپ دے دیا۔

انیس فاروقی نے طالب علمی کے زمانے ہی سے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو قصوں اور کہانیوں کا روپ دیا۔ یہ کہانیاں اخبارات میں طلباء اور نوجوانوں کے لئے مختص کردہ کالموں میں چھپتی رہیں۔ پھر ایک دن ایک دھماکے کے ساتھ یہ منظر عام پر آگئے۔ ہندوستان کے باوقار ادبی ماہنامہ "شمع" اور ہندی "سشما" نے ان کی کہانی "میری آزاد مملکت" کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ یہ کہانی

اس سے قبل انہوں نے نظام آباد میں منعقدہ ایک ادبی اجلاس میں جس کی صدارت آنجہانی سرینیواس لاہوٹی کر رہے تھے پڑھی جسے بے حد سراہا گیا۔

" میری آزاد مملکت " ایک مختصر مگر پر اثر کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے کمرے کی ہے جہاں تک نہ جلوسیوں کی آوازیں پہنچتی ہیں نہ اخبار اور ریڈیو کے ذریعہ باہر کی دنیا کے احوال۔ کہانی کے مرکزی کردار کے پاس ایک کتاب ہے۔ جو تنہائی میں اس کی واحد رفیق ہے۔ جس میں سچائی کو آدرش کہا گیا ہے۔ وہ سوچتے سوچتے زچ ہو کر مایوسی کے عالم میں اس کتاب کو بھی پھینک دیتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ آج کی دنیا میں نظریئے اور عمل کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔

" ریزہ ریزہ چاندنی " میں انیس فاروقی نے ایک چبھتا ہوا سوال اٹھایا کہ کیا آج کی دوڑتی بھاگتی مشینی دنیا میں آدمی کو کامیابی کے لئے خود اپنی زندگی جینا چاہیے یا اپنے روشن اور تابناک مستقبل کو قربان کرتے ہوئے کمزور اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بننا چاہیے۔ اپنے تیئں خود اپنا حق ادا کرتے ہوئے حقوق العباد کے کٹھن مرحلوں سے بھی آدمی کامران گزر جائے وقت و حالات اکثر اس کی اجازت نہیں دیتے۔ دوسروں کی دنیاؤں کو منور کرنے بسا اوقات آدمی کو اپنی دنیا اندھیر کر لینی پڑتی ہے۔ خواب چور چور ہو جاتے ہیں اور شب تاب چاندنی ریزہ ریزہ۔

" کھوئی ہوئی منزل " فکر معاش کے مارے ہوئے ایک نوجوان کی کہانی ہے۔ زمانے میں محبت کے سوا اور بھی غم ہیں۔ اس کہانی کا ہیرو جہد حیات کی کشاکش میں اصل حیات یعنی محبت کے مرکز پر گھوم پھر کر لوٹ آتا ہے محبت کے تقدس کا احترام اسے ایک ٹوٹے ہوئے دل کا مسیحا بنا دیتا ہے۔ " منزل کے نشاں " اور " بہاروں کا موسم " بھی ایسی ہی ہلکی پھلکی شگفتہ تحریر میں لکھی گئی رومان پرور کہانیاں ہیں " انعام " جہیز کے موضوع پر لکھی گئی مسائلی کہانی ہے۔ " ترے بنا بھی کیا جینا " جوش سے ہوش تک کے سفر کی مختصر داستان ہے۔

ریزہ ریزہ چاندنی

آج کل ان کی لکھی کہانیاں ملک کے مختلف ادبی ماہناموں اور ادبی ڈائجسٹوں میں چھپ رہی ہیں ۔ یہ امر اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کی تحریروں کو شوق سے پڑھا جارہا ہے ۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ سیدھے سادھے ہوتے ہیں انداز بیان شگفتہ سلیس دلچسپ اور غیر ضروری رمزیت سے مبرا ہوتا ہے ۔ کلائیمکس ، تحیر خیز یا چونکا دینے والا نہ ہونے کے باوجود قاری کے ذہن پر ایک خوشگوار آسودگی کے نقش چھوڑتا ہے ۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی کہانیوں کے اس پہلے مجموعہ " ریزہ ریزہ چاندنی " کو قارئین اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا ۔

محمد ایوب فاروقی صابر

بتاریخ: ۵ / جولائی ۱۹۹۴ء

پتہ: یعقوب منزل ، معراج کالونی

ٹولی چوکی حیدرآباد

سبحانہ ،باسمہ تعالیٰ

اپنی بات

یوں تو افسانے اور کہانیاں برسوں سے لکھی جارہی ہیں اس کا یہ سفر بڑا طویل ہے لیکن جب بھی کوئی واقعہ یا حادثہ ایک قلمکار، ادیب یا افسانہ نگار کو متاثر کرجاتا ہے تو وہ واقعہ یا حادثہ اس کے اپنے وجود سے چمٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے حساس ہن میں بار بار، ابھرنے ڈوبنے لگتا ہے اور وہی واقعہ یا حادثہ، کہانی یا افسانہ کی شکل یں جنم لیتا ہے۔

یں نے جتنی بھی کہانیاں یا افسانے لکھے ہیں وہ کسی نہ کسی واقعہ یا حادثہ ہی ں دین ہیں ۔ میرے افسانوں کے کردار نانی دادی ماں کی سنائی ہوئی کہانیوں یا استانوں میں نہیں بستے بلکہ میرے اطراف و اکناف کے ماحول میں بسنے والے وہ جیتے ھاگتے کردار ہیں جنہوں نے کہیں نہ کہیں مجھے متاثر کیا ہے ۔ جب کبھی میں کسی ادثے سے متاثر ہوتا ہوں تو میرا حساس قلم تب تک مجھے بے چین کیئے رہتا ہے ۔ تب تک کہ میں اس حادثے کو کوئی کہانی کا روپ دے کر صفحہ قرطاس پر نہ بکھیردوں ۔

میرا ادبی سفر ۱۹۷۵ء سے شروع ہوتا ہے یوں تو بچپن ہی سے مجھے کہانیاں پڑھنے ور لکھنے کا شوق رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی شروع کیں یرے بڑے بھائی جناب محمد ایوب فاروقی صاحب صابر جو کہ خود بھی ایک صاحب یوان شاعر ہیں، کی ہمت افزائی نے میرے اس شوق کو پذیرائی بخشی ۔ پہلی بار میری ہانی " آزاد مملکت " کو جب ہندوستان کے ممتاز فلمی ماہنامے " شمع " نئی دہلی نے مایاں طور پر شائع کیا تو یوں سمجھیئے کہ میرے ادبی سفر کا آغاز ہوگیا۔ اس پہلی کہانی کو

پڑھ کر دوست احباب اور شہر نظام آباد کے ادبی حلقوں نے سراہا تو میرے اس شوق کو تقویت ملی اور میں اس سفر میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا ۔ میری بیشتر کہانیاں اور افسانے ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں ۔ " ریزہ ریزہ چاندنی " میری ان ہی کہانیوں اور افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے ۔

جس طرح پھول کی خوشبو کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ، جس طرح کالی کالی بدلیوں سے نکلے ہوئے چودھویں رات کے چاند کی نرم نرم ٹھنڈی کرنوں کا کوئی مسکن نہیں ہوتا اور جس طرح ندی کے بہتے ہوئے پانی کے جھرنوں کی موسیقی ریز آواز پر کوئی اپنا حق نہیں جتا سکتا اسی طرح اردو زبان بھی ہر ملک ہر قوم اور ہر مذہب کے ماننے والوں کی بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے اس زبان میں گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی نرماہٹ ہے تو کسی دوشیزہ کی چنچل اداؤں کا بانکپن بھی ہمیں ملتا ہے ۔ اس شیریں زبان نے " جہاں " ولی ، میر و غالب ، انیس و اقبال ، جوش و فراق جیسے شاعر پیدا کئے ، وہیں پریم چند ، کرشن چندر ، بیدی ، منٹو ، اور قرۃ العین حیدر جیسے ناول نگار اور افسانہ نگار بھی پیدا کئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور افق ادب پر بے شمار ناول نگار اور افسانہ نگار ، ادیب و قلمکار ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں ۔ جب کوئی شاعر اپنے بچپن کی یادوں سے چمٹ کر یہ کہتا ہے کہ ع

یہ دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے اس حساس جذبے کا اظہار جس طرح اس زبان کے الفاظ کے سہارے کرتا ہے اگر اس کی جگہ کسی اور زبان کا سہارا لیتا تو شاید اپنے اس حساس جذبے کا اظہار اتنا پر درد اور کسک سے بھرپور نہ کر پاتا میری بات ممکن

ہے غلط بھی ہو۔اور پھر۔۔۔۔۔

آپ اوروں کی بات کرتے ہیں
ہم نے اپنے بھی آزمائے ہیں
لوگ کانٹوں سے بچ کے چلتے ہیں
ہم نے پھولوں سے زخم کھائے ہیں

جب تک شاعر پھولوں سے زخمی ہوتا رہے گا اور افسانہ نگار حادثات سے متاثر ہوتا رہے گا شاعری اور افسانوں کا یہ سفر یوں ہی جاری رہے گا اور باذوق قارئین کے ذوق کی تکمیل کا سامان مہیا ہوتا رہے گا۔

میں شکر گزار ہوں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا جس کی مالی اعانت کے ذریعے میں اپنے افسانوں کے اس مجموعہ کو پیش کر سکا ہوں۔

میں احسان مند ہوں میرے دوست جناب حسن فرخ صاحب کا جن کے زرین مشوروں نے اس کتاب کی اشاعت میں میری رہنمائی کی۔

میں اپنے افسانوں کے اس پہلے مجموعہ کو اس امید کے سہارے پیش کر رہا ہوں کہ اس میں شامل میرے افسانوں اور کہانیوں کو پڑھ کر باذوق حضرات کو تسکین ملے گی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہو گی۔

بتاریخ: ۵ / اگسٹ ۱۹۹۴ء
محمد انیس فاروقی

آزاد مملکت

یہ میرا کمرہ ہے۔اس کمرے کا مالک میں ہوں میں اس کمرے کے در و دیوار سے پیار کرنے لگا ہوں اس کی فضاء میری سانس کے ساتھ ہر لمحہ میرے جسم میں داخل ہوتی ہے اور رگ رگ میں رس بس جاتی ہے۔اس جسم میں جو خود ایک کمرے کی طرح ہے، جس میں روح بستی ہے۔

ایک اعتبار سے یہ دنیا کا بڑا عجیب و غریب کمرہ ہے اس کمرے پر اور اس کمرے کی فضاء پر مختصر مدت کے لئے ہی سہی، کوئی اور ذرا بھی حق نہیں جتا سکتا۔آپ کو اس کمرے میں کوئی اخبار نہیں ملے گا۔جسے پڑھ کر آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ آج آپ کے شہر یا آپ کے علاقے میں کتنے قتل ہوئے؟ کس ملک کے جنگی جہازوں نے کس ملک پر بمباری کی؟ کس سیاسی لیڈر نے کونسی چال چلی؟ کس وزیر نے عوام کو دم دلاسہ دینے کے لئے کتنا پر فریب بیان دیا؟ کس ریاست کی حکومت محض اس وجہ سے ٹوٹ گئی کہ دولت کے لالچ میں سیاسی نیتاؤں نے اپنی پارٹی کی طرف سے مونہہ پھیر کر اپنی وفاداری کا سودا کر لیا؟ ایک اخبار کے اس کمرے میں نہ آنے سے میرے کمرے کی فضاء اس اذیت ناک ماحول سے تو محفوظ ہو گئی جو اس قسم کی لرزہ خیز خبریں پڑھنے کے بعد میرے نصیب میں لازماً آتا۔

اس کمرے میں آپ کو کوئی ریڈیو سیٹ بھی نہیں ملے گا۔کیوں کہ اگر ریڈیو سیٹ ہوتا تو اسے چلانے سے لمحہ بہ لمحہ میرے کمرے کی آزادی ختم ہوتی جاتی۔یہ کمرہ کبھی دہلی بن جاتا، کبھی ڈھاکہ۔ کبھی کراچی تو کبھی واشنگٹن اور میرا کمرہ ایک آزاد مملکت ہے، جس پر نہ تو بی بی سی لندن کا قبضہ ہو سکتا ہے نہ وائس آف امریکہ کا جس میں نہ سیلون کا عمل دخل ہو سکتا ہے، نہ آسٹریلیا یا جرمنی کے کسی ریڈیو اسٹیشن کا۔

اس کمرے کی فضا پر صرف میری آواز کا تسلط ہے جب دن کے ہنگامے سرد پڑ جاتے ہیں اور رات کے سناٹے اپنا ڈیرا جماتے ہیں تو ایسے میں گویا ساری کائنات پر صرف میرے گیتوں کی آواز چھائی رہتی ہے۔ میں نے ایک طرح سے دنیا کے سارے سیاسی تصورات کو اس کمرے سے ملک بدر کر دیا ہے یقین کیجئے، میرے کمرے تک تو گلی کوچوں سے منڈلاتے ہوئے سیاسی جلوسوں کے نعروں کا شور بھی نہیں آسکتا۔ اس کمرے پر نہ سوشلزم فتح پا سکا ہے نہ سرمایہ داری کی تائید کرنے والے حضرات۔

اس کمرے میں آپ کو آرائش یا آسائش کا بھی کوئی سامان نہیں ملے گا۔ میرے جسم پر دھلا دھلایا بے حد سادہ لباس ہوتا ہے مجھے دکھ ہے تو صرف اس بات کا کہ شاید مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اپنے کمرے کی آزادی کا زیادہ عرصے تک ساتھ دے سکوں یا دوسرے لفظوں میں اپنی آزادی کو مستقل روپ دے سکوں۔ بیرونی دنیا سے اپنا تعلق قائم رکھنے کا میرے پاس صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے ایک چھوٹی سی کتاب جسے نفرت کے باوجود میں اپنے آپ سے دور نہیں رکھ سکا ہوں۔ اس کتاب میں ایک سچے آزاد منش اور بے ریا انسان کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں۔ یہ کتاب میرے لئے بڑی مقدس ہے لیکن بس اس حد تک کہ اسے پڑھا جائے تنہائی کے لمحوں اور رات کے سناٹوں میں مجھے اکثر اپنا سوچتا ہوا ذہن پریشان کرتا ہے میرے خیالات اور تصورات کا مرکز یہی کتاب ہوتی ہے، جسے کبھی بڑے احترام سے میں اپنے سرہانے رکھتا ہوں تو کبھی جھنجلا کر اپنے سے دور پھینک دیتا ہوں کیوں کہ میں فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس کتاب میں دہرائی ہوئی سچائیاں کیا صرف میرے لئے ہی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کتاب کا احترام کرتے وقت مجھے زیادہ خوشی ہوتی ہے یا اسے اپنے سے دور رکھتے وقت۔ میں نوجوان ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں ایک کچے ذہن کا مالک ہوں۔ لیکن سچائی کو تو ایک حقیقت ہونا چاہیے۔ ایسی حقیقت جسے سارے انسان حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے پر مجبور ہوں شاید میں نے ایسا نہیں کیا۔

اس کمرے میں پڑے پڑے کبھی کبھی میرے ذہن کے پردے پر شاہینہ کا معصوم چہرہ ابھرنے لگتا ہے جس نے مجھ سے پیار کیا تھا اور مجھے سچائی کے راستے پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ وہ ایک غریب پولیس کانسٹیبل کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ اس لئے غریب تھا کہ وہ رشوت نہیں لیتا تھا۔ اس کی ایمان داری کی کئی کہانیاں شاہینہ نے مجھے سنائی تھیں۔ میں شاہینہ کے والد کی ایمان داری اور شرافت سے کافی متاثر ہوا تھا اور اس کی عظمت میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ شاہینہ نے مجھے بھی اونچے آدرش کی تعلیم دی تھی اور میں اس کے خیالات سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس سے پیار کرنے لگا تھا

میں نے اپنے کمرے کی آزاد مملکت کا آپ سے تعارف تو کرا دیا اس کی فضاء اور اس میں موجود ساز و سامان سے بھی آپ کو روشناس کرا دیا۔ لیکن آپ کو یہ نہیں بتایا کہ یہ آزاد مملکت میرے قبضہ میں کیسے آئی۔ تو سنئے۔

کوئی بیس دن پہلے کی بات ہے ایوننگ کالج میں سیاسیات کے آخری پیریڈ میں حاضری دینے کے بعد جب میں اپنے گھر کی طرف آرہا تھا تو سائیکل پر لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے پکڑا گیا۔ اور جب ایک ایمان دار، رشوت نہ لینے والے کانسٹیبل نے مجھ سے رشوت طلب کی تو میرے کچے ذہن کو کچوکے سے لگے۔ میرا نوجوان خون کھول گیا اور نہ جانے کیسے میرا ہاتھ فضاء میں لہرایا اور میں نے رشوت مانگنے والے شاہینہ کے باپ کو ایک زور کا تھپڑ رسید کر دیا۔ اب اس آزاد مملکت پر میرے قبضے کی مدت صرف دس روز رہ گئی ہے۔ یہ کمرہ جیل کا ایک کمرہ ہے۔

کھوئی ہوئی منزل

دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"ذرا دیکھنا تو کون آیا ہے"۔ماں نے محبت سے زینت کو آواز دی۔وہ باورچی خانے میں کچھ پکا رہی تھیں۔

زینت نے جب دروازہ کھولا تو سامنے عامر کو کھڑا پایا...... السلام علیکم عامر بھائی یہ اچانک آپ کی آمد کیسے ہو گئی۔؟زینت وہیں کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔ابھی عامر اس کے سوال کا جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ اندر سے سلمیٰ خانم کی آواز آئی وہ پوچھ رہی تھیں۔" زینی بیٹی کون ہے۔؟آخر اسے اندر بھی بلائے گی یا باہر ہی کھڑا رکھے گی۔؟" زینت نے ماں کی آواز سنی تو شرمندہ ہو گئی اور معذرت خواہی کے ساتھ اندر آنے کے لئے کہا..... اس سے پہلے وہ خود دوڑتی ہوئی برآمدہ میں آپہنچی اور اپنی پھولتی ہوئی سانسوں کو قابو میں رکھتے ہوئے ماں سے کہنے لگی۔

"امی جان عامر بھائی آئے ہیں۔" عامر کا نام سنتے ہی سلمیٰ خانم مسکرا پڑیں اور انہوں نے ڈرائینگ روم کا رخ کیا۔کمرے میں بیٹھے عامر پر جب نظر پڑی تو وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے عامر سے مخاطب ہوئیں جو کسی سوچ میں گم فرش پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔

"عامر بیٹے کب آئے ہو۔؟ جیسے ہی سلمیٰ خانم کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی وہ احتراماً کھڑا ہو گیا اس نے انہیں سلام کیا اور گویا ہوا۔"بس دو ہی دن ہوئے ہیں چچی جان"۔سلمیٰ خانم نے اس کا ماتھا چوم کر درازی عمر کی دعائیں دیں اور اس سے گفتگو میں منہمک ہو گئیں۔ساتھ ہی زینت کو چائے کے ساتھ کچھ ناشتہ بھی لانے کی ہدایت کر دی۔

ادھر حنا اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی چھ ماہ کی معصوم بچی کا فراک بدل رہی تھی جب اس نے سنا کہ عامر آئے ہیں تو جیسے کسی نے اس کے دل کے دریچوں پہ دستک دے ڈالی ہو۔ وہ بے چین سی ہو گئی اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ اور سانسیں بے ربط چلنے لگیں وہ اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی عامر ایک نام جو اس کی ہستی میں مدغم ہو چکا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں دور کہیں اس نے چھپا رکھا تھا۔ ڈھیروں راکھ تلے دبی چنگاری کی طرح اس نے اپنے ارمانوں کی ڈھیروں راکھ تلے اس نام کو دبائے رکھا تھا۔ آج پھر ایک بار اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ جو کواڑ برسوں پہلے اس نے بند کر دیئے تھے وہ کھولے یا نہ کھولے ایک عجیب سی کشمکش میں وہ مبتلا ہو گئی تھی۔ اور سوچ کے گہرے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی کہ اس کی بہن زینت نے اسے آواز دی "باجی عامر بھائی آئے ہیں اور امی آپ کو بلا رہی ہیں۔

وہ پھر سوچ میں گم ہو گئی دراصل وہ یہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ عامر سے ملے یا نہ ملے زینت نے اسے پھر آواز دی۔

"باجی کہاں کھو گئیں آپ؟ دیوان خانہ میں امی اور عامر بھائی آپ کے منتظر ہیں چلیئے۔" اور پھر زینت اسے اپنے ہمراہ لے گئی۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی عامر کی نگاہیں حنا کی نگاہوں سے ٹکرائیں اس نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ عامر نے جواب دیا لیکن حنا کی حالت دیکھ کر اس کے چہرے پر کرب کی لکیریں پھیلتی چلی گئیں..... کہاں وہ شاداب چہرہ رخساروں پر ہر وقت سرخی پھیلی ہوتی تھی اور اب اس کے رخسار پچک سے گئے تھے۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے گرد حلقے سے بن گئے تھے۔ عامر کا دل حنا کی اس حالت پر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حنا اس طرح بکھر کر رہ جائے گی۔ سلمیٰ خانم اور زینت اسے تنہا چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

"حنا یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے اپنی۔" عامر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے مجھے عامر اچھی بھلی تو ہوں" حنا نے جواب دیا نہ جانے کیوں اس کی آواز درد بھری ہونے لگی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے امڈ آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی سعی ناکام کر رہی ہے۔

"یہ تمہاری آنکھوں کے گرد گہرے اور کالے حلقے پچکے ہوئے گال ابھری ہوئی ہڈیاں، مرجھایا مرجھایا سا چہرہ اور سانولی ہوتی ہوئی رنگت یہ سب کیا ہے بالکل مریضہ لگ رہی ہو اور کہہ رہی ہو کہ اچھی بھلی تو ہوں۔ کیا ہوا ہے مجھے۔! کیا میں اسی حنا کو دیکھ رہا ہوں جسے میں چار سال قبل چھوڑ گیا تھا۔ عامر نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

چار سال کا عرصہ تو بہت طویل ہوتا ہے عامر۔ اتنے سالوں میں کیا کچھ نہیں بدل جاتا وقت کی آندھی سب کچھ اپنے ساتھ اڑا لے جاتی ہے میں تو ایک معمولی سا تنکہ تھی ان چار سالوں میں حنا نے بہت سی آندھیوں کا مقابلہ کیا ہے عامر۔! اس کی زندگی میں بہاریں کبھی نہ آسکیں ہر وقت خزاؤں نے ہی پہرا جمائے رکھا میں ایک معمولی سی ہستی بھلا کن کن آندھیوں سے ٹکراتی بس بکھر گئی تنکوں کی طرح۔ سوکھے ہوئے پتوں کی طرح میری زندگی ہواؤں کے دوش پر دور تک بکھرتی چلی گئی اور اب باقی رہ گیا ہے میرا یہ وجود ایک زندہ لاش کی طرح میں اسے اٹھائے پھر رہی ہوں، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔ عامر آگے بڑھا اور سہارا دے کر اسے کرسی پر بٹھا دیا اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کر لئے اور کہا۔!

میں اب آگیا ہوں حنا۔ اب تمہیں گھبرانے کی یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری زندگی کی روٹھی ہوئی بہاریں پھر لوٹ آئیں گی میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنے سارے غم بھول جاؤ گی۔! اس کی آواز میں

اعتماد جھلک رہا تھا اس نے حنا سے تیار ہونے کے لئے کہا اور خود چلا گیا کوئی پندرہ منٹ کے بعد وہ ٹیکسی لے کر پھر حاضر ہو گیا اس نے سلمیٰ خانم سے اجازت لے کر حنا اور زینت دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ شہر کے مشہور فزیشن ڈاکٹر سے حنا کا مکمل معائنہ کروا کے ان سے دوائیں لکھوائیں قریبی میڈیکل ہال سے دوائیں خرید کر وہ تینوں واپس پہنچے گھر پہنچ کر عامر نے سلمیٰ خانم سے کہا۔

چچی جان ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ حنا کو تھوڑی سی کمزوری ہو گئی ہے اور اسے آرام کی ضرورت ہے کچھ دوائیں لکھی ہیں وہ میں نے خرید لی ہیں دوائیں پابندی سے استعمال کروائیں اور اس کا خاص خیال رکھیں۔

"بہت بہتر بیٹے تم آگئے ہو تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا بیٹا لوٹ آیا ہے۔ خدا تمہیں خوشیاں عطا کرے۔ انہوں نے دعائیں دیں۔ عامر پھر آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے لوٹ گیا لوٹنے سے قبل پھر ایک بار اس نے حنا کو تاکید کی کہ دوائیں پابندی سے استعمال کرے وہ چلا تو گیا لیکن حنا کا صبر و قرار چھین کر لے گیا کتنی مشکل سے وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی اندر ہی اندر اپنے سارے غم پیتی رہی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد بیوگی کا سفید بے داغ لباس اس کے وجود کو اپنے اندر لپیٹے رکھا تھا۔ ویسے تو وہ جینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن دو معصوم بچے اس کو جینے کا حوصلہ بخش رہے تھے۔ ان کی خاطر وہ اپنے وجود کو ایک زندہ لاش کی طرح گھسیٹ رہی تھی لیکن آج اچانک عامر کی آمد اس کی زندگی میں ایک نیا طوفان لے آئی تھی ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اس کی ہستی میں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پٹ سے لگی کھڑی تھی اور باہر نیلے آسمان کو بے وجہ ہی تکے جا رہی تھی پھر وہ ماضی کے افق پر سوچ کے پر پھیلائے دور بہت دور تک اڑتی چلی گئی۔

عامر اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے تھے اور جیسے جیسے ان کی عمریں بڑھتی گئیں ان کے جذبوں میں بھی فرق آتا گیا۔ جوں جوں وہ بچپن کی سرحد پھلانگ کر جوانی کی دہلیز پر قدم

رکھنے لگے ایک دوسرے سے چاہت کا جذبہ بھی ابھر کر سامنے آنے لگا۔ عامر نے اس کے دل کے دروازے پر دھیرے دھیرے دستک دی اور وہ دل کے کواڑ اس خوب رو اور نیک انسان کے لئے وا کر دیئے اور وہ چپکے سے آبیٹھا دبے دبے قدموں سے اسے احساس تک نہ ہونے دیا تب وہ دونوں ایک دوسرے کے نے بے قرار رہتے۔ ملنے کے لئے تڑپ جاتے اور جب ملتے تو مستقبل کے سہانے خواب بننے لگ جاتے اور میٹھی میٹھی باتوں میں یوں گم ہوتے کہ ارد گرد کے ماحول سے بھی بے خبر ہو جاتے۔

عامر ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد محکمہ تعمیرات میں منتظم تھے۔ گھر میں اس سے چھوٹا ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں جو اس قابل ہو گئی تھیں کہ ان کی شادی کی جا سکتی تھی۔ وہ ابھی زیر تعلیم تھا۔ اور ڈگری کورس کے آخری سال کا طالب علم تھا۔ اس کے والد ناصر چچا ایک انتہائی ایماندار اور دیندار آدمی تھے۔ چنانچہ مال حرام سے خود کو بچائے رکھتے گھر کا خرچ اپنی ماہانہ تنخواہ میں بڑی کوششوں سے جوں توں پورا کر پاتے۔ جوان دونوں لڑکیوں کے لئے وہ متفکر رہتے وسائل کی کمی کے باعث وہ ابھی اپنے اس فرض سے سبکدوش ہونے سے قاصر تھے۔ ان کی ساری امیدیں بس عامر سے وابستہ تھیں۔ عامر کافی سمجھ دار تھا اور اپنی ذمہ داریوں کو خوب جانتا تھا اپنے والدین کو دلاسہ دیتے رہتا کہ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اپنی تعلیم مکمل کر کے ملازمت سے لگ جائے تاکہ والدین کی فکریں کچھ کم ہوں۔ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کے بہنوں کی شادی ان سب کے لئے سنگین مسئلہ بن جائے گی اور ساتھ ہی وہ حنا کو بھی کھو بیٹھے گا۔ اپنے مستقبل کے ان ہی پروگراموں کے زیر اثر وہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے رہا تھا دیر رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہتا۔

حنا کے والد ایک بزنس مین تھے اچھا کاروبار تھا چنانچہ پیسے کی بھی کافی ریل پیل تھی۔ لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی دونوں بچیوں کو دنیا کی اونچ

نیچ سے واقف کرادیا تھا۔ بڑوں کی عزت و احترام اور چھوٹوں سے محبت و شفقت کی بھی تعلیم دی تھی۔ انہیں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اسی لئے وہ حنا اور زینت سے بے حد محبت کرتے تھے ان کی ہر خواہش پوری کرتے۔ ان کے پاس تعلیم کی بھی اہمیت تھی یہی وجہ تھی کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں تھے۔ اسی لئے انہوں نے حنا کو انٹر کرلینے کے بعد گریجویشن میں داخلہ دلوایا تھا وہ تھی بھی ذہین خوب صورتی اور ذہانت کا میل کچھ یوں ہوا تھا کہ اس کی ساتھی لڑکیاں سب اس سے مرعوب رہتیں کالج کے اساتذہ بھی اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے۔

وقت بھی کہیں رکا ہے طائر وقت اپنے پر پھیلائے گیا اور دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ موسم بدلے رتیں بدلیں، کبھی بہار کا موسم رہا تو کبھی موسم خزاں۔ ادھر عامر اپنے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر میں سرگرداں ہو گیا۔ ڈگری کورس کے بعد ملازمت کی تلاش اس کا عین مقصد بن گیا دن میں ملازمت کی تلاش اور شام میں کمپیوٹر کورسس کی ٹریننگ کرنا یہی اس کے روز کا معمول تھا لیکن خدا کو کیا منظور تھا یہ بھی کوئی جان سکا ہے ادھر حنا نے ڈگری کورس کی تکمیل کرلی تھی اور اب اس کے والد سیٹھ برہان الدین چاہتے تھے کہ اس کی شادی کردیں۔ وہ کسی موزوں رشتہ کی تلاش میں تھے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کے علاوہ ادارہ پیامات کی بھی خدمات انہوں نے حاصل کرلی تھیں جب حنا کے کانوں میں اس بات کی خبر ہونے لگی تو وہ پریشان ہونے لگتی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہوکر دعائیں مانگا کرتی، عامر کو کوئی معقول ملازمت مل جائے تا کہ وہ اس کا ہاتھ اس کے ابا سے مانگ سکے۔

عامر بھی ان دنوں کافی فکر مند رہنے لگا ایک جانب وہ ملازمت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا تو دوسری جانب حنا کے لئے رشتوں کی خبریں اس کے لئے جان لیوا بننے لگی تھیں۔ اور پھر گھر بیٹھی دو جوان بہنوں کی شادیوں کی فکر الگ اس کے لئے سوہان روح بنتی جارہی تھی۔ وہ کرے تو کیا کرے اس کی سوجھ بوجھ جواب دینے لگتی۔

بالآخر اس نے حالات کی نیا کو اس ناخدا کے ہاتھ چھوڑ دیا جو اس ساری کائنات کا خالق تھا۔ آج کل اس کی ملاقاتیں بھی حنا سے بہت کم ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے ہی مسائل میں یوں الجھا رہتا کہ حنا سے ملاقات کے لئے وقت نکالنا اس کے لئے مشکل تھا۔

آج جب وہ دن بھر مختلف دفاتر کے چکر کاٹ کر گھر لوٹا تو ایک ایسی خبر اس کی منتظر تھی جسے سننے کے بعد اسے یوں لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو اس کی چھوٹی بہن فردوس نے اسے بتایا کہ حنا کا رشتہ طے ہو گیا ہے دو ایک دن کے بعد منگنی ہو گی۔ "سنا ہے لڑکا جدہ کی کسی مشہور کمپنی میں انجینیر ہے۔" یہ خبر اس کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھی اس نے خود پر مشکل سے قابو پایا اور آرام کرسی پر دراز ہو کر فردوس کو ایک گلاس پانی کے لئے کہا۔ ٹھنڈے پانی سے جب اس کی طبیعت بحال ہوئی تو اس نے فردوس سے کہا کہ وہ کسی طرح اس کا پیام حنا تک پہنچا دے کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے پھر اس نے فردوس کو دوسرے دن کا سارا پروگرام سمجھا کر حنا کے پاس روانہ کر دیا۔

دوسرے دن شام میں وہ اندرا پارک کے اسی مخصوص گوشے میں بیٹھے تھے جہاں وہ اکثر ملا کرتے تھے۔ حنا کا چہرہ مرجھائے ہوئے گلاب کی طرح لگ رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے پچھلی رات اس نے بڑے کرب میں گزاری ہو آنکھیں صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ ان سے آنسوؤں کی کافی برسات ہو چکی ہے۔ عامر نے جب اسے دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس سے حنا کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اس نے حنا سے کہا یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے حنا.....؟ تم عامر کی حنا ہو حنا جو خود پس کر دوسروں کو خوب صورت رنگ عطا کرتی ہے۔ انہیں سنوارتی ہے..... حنا تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ عامر کے الفاظ ابھی تھمنے بھی نہ پائے تھے کہ حنا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگی۔ اسے سمجھانا عامر کے بس سے باہر لگ رہا تھا پھر بھی اس نے اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کئے اور دل پر جیسے

پتھر رکھ کر اس نے کہا:

"حنا ہمیں اپنی محبت کی قربانی دے کر اپنے والدین کی عزت و آبرو کی لاج رکھنا ہوگا۔ زندگی بہت طویل سفر ہے آج اگر ہم بچھڑ بھی جائیں تو کچھ غم نہیں ۔ ممکن ہے زندگی کے اس طویل سفر میں کسی دوراہے پر اتفاقی طور پر ہماری ملاقات ہوجائے۔ بس تم اتنا کرم مجھ پر کرنا کہ اس دوراہے پر مجھے ضرور پہچان لینا میں تمہارا منتظر ملوں گا اب آج کے بعد تمہاری راہیں الگ ہیں اور میری راہیں الگ ۔یہی قدرت کا فیصلہ ہے جس کا احترام ہم دونوں پر لازم ہے تم ایک باہمت لڑکی کی طرح والدین کی پسند کو اپنی پسند بنالو اور زندگی کی راہوں میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاو اور یہ ثبوت دو کہ تم کوئی معمولی لڑکی نہیں، ہو تم میں چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ ہے۔ تم ہر حالات کا مقابلہ کر سکتی ہو کیوں کہ تم نے مجھ سے محبت کی ہے۔ تم عامر کی محبوبہ ہو حنا۔ محبت کبھی کبھی قربانی بھی طلب کرتی ہے۔ جسے ہمیں خوشی خوشی دینا ہوگا۔ میری یہی دعا ہے کہ خدا تمہیں خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی عطا کرے۔ آمین

پھر خدا حافظ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بالکل ایک لٹے ہوئے جواری کی طرح پژمردہ قدم ڈالتا ہوا اس نے آج اپنی زندگی کی ایک اہم بازی ہار دی تھی۔

کہتے ہیں انسان کا رزق خدا نے جہاں رکھا ہے۔ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ عامر کو جب یہاں کوئی ملازمت نہ ملی تو اس نے خلیجی ممالک جانے کی ٹھان لی۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پاسپورٹ بنوالیا اور جہاں وہ معمولی سی نوکری کے لئے جدوجہد کررہا تھا اور ناکامی اس کے ہاتھ آرہی تھی وہیں خدا نے چھوٹی سی کوشش پر اسے ہزاروں روپے ماہانہ کی ملازمت دلوادی اس کا ہر کام جیسے پر لگا کر ہورہا تھا ویزا آتے ہی پاسپورٹ پر اندراج اور ٹکٹ وغیرہ بس لمحوں میں بن کر آگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جدہ کے لئے پرواز کر گیا۔ حنا کو جب اس کے جانے کی خبر فردوس سے ملی تو اس کی آنکھوں سے جدائی کے چند آنسو ٹپک کر فردوس کے رومال میں جذب ہوگئے ایک سرد

آہ اس کے سینے سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

عامر کے جانے کے ٹھیک ایک ماہ بعد حنا کی شادی ہو گئی وہ دلہن بنی اپنے اجنبی ساتھی کو تصور میں سجائے سرخ ماروتی میں سوار سسرال چلی گئی لیکن عامر کی یاد اور اس سے آخری ملاقات اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی تھی وہ سوچتی کتنے اونچے ظرف کا مالک تھا وہ کس آسانی سے اسے والدین کی پسند کو اپنی پسند بنا لینے کی ترغیب دے گیا تھا وہ..... عامر واقعی ایک اونچے کردار کا مالک تھا اس کا یہی اونچا کردار اور پاکیزہ محبت اس کی زندگی کا سرمایہ بن گیا تھا۔ اور وہ عامر کی یاد کی چنگاری اپنے سینے میں دبائے قدرت کے اس فیصلے پر سر تسلیم خم کئے اپنے دولہا کے گھر چلی گئی تھی۔

وقت کی سوئی آگے بڑھتی گئی اس طرح دو سال بیت گئے عامر کو کمپنی کی جانب سے چھٹی ملنے کے باوجود اس نے وطن آنا مناسب نہ سمجھا۔ والدین کے کئی خطوط اسے ملے کہ چھٹی میں وطن ضرور واپس آجاؤ لیکن اس نے کام کا بہانہ بنا کر معذرت کر لی اور وہیں رہا در اصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ اس کے دل میں حنا کی یاد خلش بن کر ابھرے اور اس کے مندمل ہوتے ہوئے زخم پھر سے ہرے ہو جائیں۔ وہ وہیں کام میں اور دوستوں کے سہارے اپنے سارے غموں کو بھلا کر وقت کاٹتا رہا اس کے والدین کے مسائل اب اللہ کے کرم سے حل ہو گئے تھے بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری لڑکی فردوس کا رشتہ بھی اب پکا ہو چکا تھا وہ چاہتے تھے کہ اگر عامر وطن لوٹے تو بھائی اور بہن کی شادی ایک ساتھ کر دیں گے لیکن عامر نے یہ لکھ کر کہ پہلے فردوس کی شادی کر دیں اس کی شادی کے لئے فکر مند نہ ہوں۔ والدین کو چپ کرا دیا تھا۔

کچھ دن یوں ہی بیت گئے فردوس کی بھی شادی ہو گئی۔ عامر تب بھی وطن نہ لوٹا بہن کی شادی میں خود پر جبر کر کے شریک نہ ہوا حالانکہ اس کی یاد اور بہن کو تصور میں دلہن بنی دیکھ کر اس کی آنکھوں کے گوشے بار بار نم ہوتے رہے دل روتا گیا لیکن

دل پر جبر کر کے مبارکبادی کا تار اور خطوط اس نے روانہ کر دیئیے اور ساتھ ہی ساتھ دولہا دلہن کے لئے خوبصورت تحائف بھی بھیج دیئیے۔

ادھر حنا شادی کے بعد سسرال چلی گئی اس کے شوہر آصف بھی ایک نیک صفت انسان تھے لیکن اس کی ساس ایک لالچی عورت تھیں ہر وقت کوئی نہ کوئی مطالبہ اس کے سامنے سوہان روح بنتا رہتا جس کے باعث اس کے والدین بھی عاجز آچکے تھے۔ آصف کے کاندھوں پر بھی اپنی ان بیاہی بہنوں کا بوجھ تھا۔ اسی لئے شاید انہوں نے فیملی ویزا کی سہولت ملنے کے باوجود حنا کو اپنے پاس محض اس لئے نہیں بلایا کہ اس کے آنے کے بعد اخراجات بڑھ جائیں گے وہ ہر ماہ ایک معقول رقم گھر کے خرچ اور بہنوں کی شادی کے لئے بھیجا کرتے تھے ساتھ ہی حنا کے لئے بھی ایک معقول رقم علحدہ سے بھیجتے تھے لیکن وہ رقم بھی اس کی ساس یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیتیں کہ جب بھی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا لیکن اپنی ضرورت پر پیسے طلب کرنے پر یہ جواب سننا کہ اس ماہ کا خرچ گزشتہ ماہ سے بڑھ گیا ہے اور پیسے ناکافی ہو رہے ہیں ایک معمول بن گیا تھا۔ پھر اسے مجبوراً اپنے والدین سے مدد لینی پڑتی اس نے کئی بار سوچا کہ آصف کو خط لکھ کر گھر کے حالات سے آگاہ کر دے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہی کہ اپنی وجہ سے وہ انہیں پریشانی میں مبتلا کیوں کرے ہر تکلیف برداشت کرتی رہی کہ اب یہی اس کی تقدیر بن چکی تھی۔ شادی ہوئے دیڑھ سال ہو رہے تھے اسی درمیان اللہ نے اسے ایک خوب صورت پھول جیسا لڑکا عطا کیا وہ خوشی سے نہال ہو اٹھی کہ دلچسپی کا ایک کھلونا اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ عاطف کو پا کر اس نے اپنے سارے غم بھلا دیئیے تھے اس کی مسکراہٹوں میں اور اس کی معصوم شرارتوں میں خود کو سمو دیا تھا۔ دو سال کی چھٹی پر جب آصف آئے تو بیشمار کھلونے انہوں نے عاطف کے لئے لائے۔ حنا کے لئے بھی خوب صورت قیمتی ساڑی اور جڑاؤ کنگن لائے جب تک وہ رہے وہ خود کو مطمئن سا محسوس کرتی رہی انہوں نے اسے بھرپور پیار دیا بے پناہ خوشیاں دیں لیکن

یہ سب عارضی ثابت ہوئیں۔ آصف جیسے ہی واپس ہوئے گھر کا ماحول پھر بدلتا گیا اس نے اپنی کشتی حیات حالات کے منجدھار پر چھوڑ دی اور یہ سوچا کہ خدا کو جو کچھ منظور ہوگا ہوتا رہے گا۔ گھر کے ماحول میں کافی حد تک وہ خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتی رہی اور ہر تکلیف صبر و استقلال سے سہتی رہی اس کی گود میں دوسرا پھول نازیہ کے روپ میں کھلا اور ابھی اس معصوم کی عمر ایک ماہ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی زندگی میں طوفان آگیا آصف جدہ میں کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ پھر بیوگی کا سفید اور بے داغ لباس اس کا مقدر بن گیا۔ اس کی ساس نے اس کے ماتھے پر بے جا منحوس ہونے کا داغ لگا کر اسے میکے بھیج دیا۔ اور اب وہ کوئی چھ ماہ سے اپنے میکے میں رہنے لگی تھی۔ وہ سوچ میں گم بیتے ہوئے لمحوں کا حساب کر رہی تھی کہ زینت کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"باجی کہاں کھو گئیں آپ۔ ناز و رو رہی ہے اسے دودھ ہی پلا دیں....! تب وہ چونکی اور نازیہ کی طرف لپکی جو زار و قطار رو رہی تھی۔

آج کوئی ایک ہفتہ بعد عامر پھر آیا تھا وہ سلمیٰ خانم سے اجازت لے کر سیدھا حنا کے کمرے میں چلا آیا۔ حنا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے بال سنوار رہی تھی دونوں بچے قریب ہی پلنگ پر میٹھی نیند سو رہے تھے۔ جیسے ہی آئینے میں اس نے عامر کا عکس دیکھا جو بغور اس کی پشت سے اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

آئیے تشریف رکھیئے"۔

اس نے قریب ہی پڑی ایک کرسی اس کی جانب سرکا دی وہ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ حنا پر ڈالتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کہو کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔؟ دوائیں پابندی سے کھا رہی ہو یا نہیں۔؟ اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں اللہ کی مہربانی ہے طبیعت بھی اب سنبھلتی جا رہی ہے یوں لگ رہا ہے جیسے کھوئی ہوئی چستی آہستہ آہستہ لوٹ رہی ہے"۔ حنا نے ٹھنڈی سانس

بھرتے ہوئے کہا۔ عامر ایک بات بتائیں یہ آپ اچانک ہی کیسے آگئے کہ بہنوں کی شادی میں بھی شرکت نہ کی اس نے عامر کے چہرے پر سوالیہ نگاہیں جمادیں۔

"گزشتوں دنوں مجھے فردوس کا ایک خط ملا اس نے تمہارے بارے میں تفصیل لکھی۔ جب پڑھا تو نجانے کیوں مجھے اپنے اوپر بہت غصہ آیا۔ مجھے یوں لگا سب حالات کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ تمہاری زندگی میں نے ہی خزاؤں کے حوالے کر دی ہے نہ میں تمہیں کھوتا اور نہ تمہاری یہ حالت ہوتی جس روز مجھے خط ملا اس رات میں سو نہ سکا۔ رات بھر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا اور یہی طعنہ دیتا رہا کہ بہت دعوے کرتے تھے تم محبت کے اپنی محبت کو رسوا ہونے کے لئے چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لی اور اپنی محبوبہ کو در در کی ٹھوکریں کھانے اور بھٹکتے رہنے کے لئے چھوڑ آئے اگر واقعی تم نے حنا کو چاہا ہے تو جاؤ آج بھی اسے اپنا لو۔ محبت تو پاک ہوتی ہے یہ تو روحوں میں بستی ہے پھر کیوں نہیں تم اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام لیتے۔ پھر ایک بار ثابت کر دو کہ محبت سماج کے بنائے ہوئے اصولوں اور ضابطوں سے بالاتر ہے۔ وہ رات میرے اوپر قیامت ڈھاتی رہی جس طرف کروٹ بدلتا تمہارا معصوم لیکن اجڑا ہوا چہرہ میرے تصور پر چھا جاتا۔ ساری رات کرب کے عالم میں گزار کر میں نے دوسرے دن چھٹی کے لئے درخواست دے دی اور شاید خدا کو بھی میری اس حالت پر رحم آگیا ہو کمپنی نے میری درخواست منظور کر لی پھر میں نے دو تین دن کے اندر اندر اپنی واپسی کی تیاری مکمل کر لی اور چلا آیا۔

ملازمہ چائے کے ساتھ ناشتہ بھی لاکر رکھ گئی تھی حنا نے چائے بنا کر پیالی عامر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"عامر کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ میرا مقدر تھا۔ بھلا تقدیر کا لکھا بھی کہیں بدلا جا سکتا ہے کیوں اپنی زندگی کو گھن لگانا چاہتے ہو؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو..... یہ دو معصوم ہی اب میرا سہارا ہیں۔ بقیہ

زندگی جیسی بھی ہو گزر جائے گی..... آپ کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لیں اور اپنی زندگی آرام سے گزاریں۔ مجھ بد نصیب کے ساتھ بھلا کون خوش رہ سکتا ہے۔؟"
یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی لاکھ ضبط کے باوجود آنسو اس کی پلکوں کے باندھ توڑ کر باہر نکل پڑے اس نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی غرض سے چہرہ دوسری جانب پھیر لیا لیکن آئینہ میں اس کا عکس اس کی حالت کی چغلی کھا رہا تھا جب غبار چھٹا تو اس نے اپنے آپ کے بہت قریب عامر کو پایا۔ وہ اس کے نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ وہ کہنے لگا:

"حنا اگر تمہیں میری خوشیاں عزیز ہیں اور تم چاہتی ہو کہ عامر اپنی زندگی سکھ اور چین سے گزارے تو میری بات مان لو میں آج ہی اپنے ابا کو تمہارے ڈیڈی کے پاس بھیج رہا ہوں۔ تمہاری اور میری شادی طے کرنے.....! میں نے عہد کیا ہے کہ تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنے سارے دکھ بھول جاؤ گی مجھے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر لینے دو..... اگر تم نے ہاں کر دی تو میں سمجھوں گا کہ میری کھوئی ہوئی منزل مجھے پھر مل گئی ہے کہو حنا۔ تم کیا چاہتی ہو۔؟ مجھے تمہارا جواب چاہیے"۔ عامر اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے تھام چکا ہے۔

حنا کے وجود میں ایک طوفان سا برپا تھا اس کی کھوئی ہوئی محبت اسے آواز دے رہی تھی اس کا محبوب اسی سے اسی کو مانگ رہا تھا وہ کرے تو کیا کرے.....
ایک طرف اس کی کھوئی ہوئی محبت تھی تو دوسری جانب سماج..... وہ کس کا ساتھ دے اگر وہ سماج کی پروا کرے گی تو عامر کی زندگی لٹ جائے گی۔ بکھر کر رہ جائے گی اور محبت ہمیشہ کے لئے رسوا ہو جائے گی۔ پھر اس کے ذہن کے پردے پر بیتے ہوئے سارے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے پھر نجانے کس جذبے کے تحت اس نے عامر کے بازو مضبوطی سے تھام لئے اور کہا۔ "مجھے منظور ہے"۔ حنا کا جواب پا کر عامر خوشی میں جھوم اٹھا خوشی کے احساس سے بیخود ہو کر اس نے حنا کے ہاتھ چوم لئے اور چلا گیا۔

وہ جب جانے لگا تو حنا نے اس تقدس و پاکیزگی سے اس کی جانب دیکھا جیسے وہ کوئی انسان نہیں فرشتہ ہو۔ اس نے زیر لب کہا۔

"عامر آج تم نے فرشتوں کو بھی شرما دیا ہے آج غالباً وہ بھی تمہیں سلام کرتے ہوں گے۔ پھر اس کی آنکھوں سے دو آنسو اس کے رخسار کا سہارا لے کر گر پڑے اور آنچل میں جذب ہو گئے۔! یہ آنسو خوشی کے تھے.... یا کسی کی عظمت پر نکل آئے تھے۔ وہ انہیں کوئی عنوان نہ دے سکی۔!!

گونگے آئینے

چھناک کی آواز کے ساتھ ہی آئینہ ٹوٹ کر فرش پر بکھر گیا اور آئینے کی کرچیاں جیسے اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئیں۔ دل کا درد کرب بن کر چہرے پر چھا گیا اور وہ اپنا سانولا چہرہ ہتھیلیوں کی کٹوریوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ایسے وقت گھر کے سب ہی افراد اسے تنہا چھوڑ دیتے تاکہ وہ اپنے غم کے احساس کو خود ہی مٹا سکے۔

یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا کہ وہ اس درد کے صحرا سے نہ گزری ہو۔ اس کے احساس کے نازک آبگینے کئی بار ٹوٹ چکے تھے۔ اکثر جگہوں سے اس کے لئے پیامات آتے رہے اور اکثر اوقات لوگ دیکھنے آیا کئے۔ ہر بار اسے سجا سنوار کر خوب صورت ریشمی ملبوسات میں اس کے وجود کو سمیٹ کر کسی شوکیس میں سجی بے جان مورتی کی طرح مختلف انداز میں اور مختلف زاویوں میں دکھایا گیا لیکن ہر بار نتیجہ ایک ہی رہا۔ کبھی کسی نے اس کے بالوں پر اعتراض تراشا تو کبھی کسی نے اس کے سانولے رنگ کو اپنی ناپسندیدگی کا سبب قرار دیا اور جب ان باتوں کی بھنک اس کے کانوں میں پڑتی تو وہ بے بس ہوجاتی اور پھر وہی آئینہ جس کے مقابل اسے بٹھا کر سنوارا جاتا، جو اس کے غموں کا، اس کے زخموں کا ہم راز بھی ہوتا۔ اس کے نازک احساسات کا نشانہ بنتا، ایک چھناکا ہوتا، آئینے کی کرچیاں فرش پر بکھر جاتیں اور وہ اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔

ویسے فرحین میں کسی بات کی کمی نہ تھی اس نے سائینس میں گریجویشن کیا تھا تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری میں بھی وہ طاق تھی انتہائی سلیقہ مند اور سلیقہ شعار۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گھریلو کاموں کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔ دیکھنے میں بھی وہ کوئی بری نہ تھی۔ قبول صورت تو اسے کہا ہی جا سکتا

تھا۔ کتابی چہرہ، بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں اور ستواں ناک۔ صرف رنگ ہی کچھ سانولا سا تھا۔ لیکن اب تک وہ کسی کی نظروں میں نہ جچ سکی تھی۔ جب کبھی وہ مایوسی کا شکار ہوتی تو ذہن کے کسی دریچے سے ایک خیال ابھرتا کہ شاید اسی میں خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو اور پھر فوراً ہی وہ خود پر قابو پا جاتی۔

فرحین کے والد احسن علی ایک پرہیزگار آدمی تھے۔ انہوں نے اس بات پر کبھی مایوسی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا، بلکہ ہر بار ان کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی "شاید اللہ کی یہی مرضی ہو"۔ فرحین کا نمبر گھر میں تیسرا تھا اور وہی خوب صورتی میں دوسروں سے کچھ پیچھے تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں نشاط اور فرحت کافی خوب صورت تھیں اور ان کی شادیاں دو، دو سال کے وقفے سے اچھے خاندانوں میں ہو چکی تھیں۔ فرحین کے بارے میں اس کی بہنیں بھی اکثر فکر مند رہا کرتی تھیں۔ وجہ ظاہر تھی آج کل اچھا بر درکار ہو تو دو چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایک تو لڑکی حسین ہو، دوسرے دولت بھی ہو جس کے بل پر اچھا بر خریدا جا سکے، کیونکہ آج کل شادی بیاہ بھی ایک بیوپار بن چکا ہے۔ شادی کی منڈی میں لڑکیوں کی بہتات اور لڑکوں کی کمی نے صورت حال یہ پیدا کر دی ہے کہ جس نے بولی زیادہ لگائی، مال اسی کا ہو گیا۔ دولہے بکنے لگے ہیں اور باضابطہ لڑکوں کا نیلام ہونے لگا ہے اور یہاں احسن علی کا معاملہ یہ تھا کہ بے چارے معمولی کلرکی سے ترقی پاتے ہوئے منتظمی تک پہنچے تھے۔ آمدنی محدود تھی اور ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ۔ اپنے نفس کو دبا کر انہوں نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور دونوں بڑی لڑکیوں کی شادیوں سے جیسے تیسے سبک دوش ہوئے لیکن فرحین کا رشتہ طے ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اکثر جگہوں سے جوڑے کی معقول رقم کا مطالبہ اور جہیز کی لمبی چوڑی فہرستیں بھی آچکی تھیں، لیکن ان کے بس کی بات بھی تو ہو۔ وہ بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے اور اپنے خدا پر بھروسہ کیے رہتے کہ کوئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی۔

آج جب چھناکا ہوا اور پڑوس سے کسی لڑکی کی مدھم مدھم سسکیوں کی آواز فضا میں ابھری تو فرید چونک پڑا اور بے چینی محسوس کرنے لگا، کیوں کہ لڑکی کی سسکیاں وقفے وقفے سے ابھر رہی تھیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے اپنے گھر میں کوئی رو رہا ہو۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو اس نے اپنی چھوٹی بہن زریں کو آواز دی جو برآمدے میں بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی۔

"جی بھائی جان، فرمائیے۔" زریں نے قریب آکر بھائی سے پوچھا

"زریں، میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے احسن چچا کے گھر سے ایک چھناکے کی آواز سنی۔ جیسے آئینہ ٹوٹا ہو، اور ساتھ ہی کسی لڑکی کے رونے اور سسکنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ واقعہ کیا ہے؟ فرید نے ایک ہی سانس میں زریں سے سب کچھ کہہ ڈالا۔

"کیا کریں گے بھائی جان آپ یہ سب جان کر"؟ زریں کے لہجے میں افسوس اور ہمدردی کا جذبہ شامل تھا۔

"پھر بھی کچھ معلوم تو ہو"۔ فرید نے مزید کریدا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے بھائی جان کہ آپ جان کر بھی کچھ کر نہیں پائیں گے پھر بھی اگر آپ جاننے کے لئے بضد ہیں تو سنئے۔ احسن چچا کی چھوٹی لڑکی فرحین، جو میری کلاس فیلو رہ چکی ہے، اسی کی تھیں وہ سسکیاں، جو شاید اپنی تقدیر پر رو رہی تھی۔ بے چاری لڑکیوں کی بھی کیا قسمت ہوتی ہے۔ آج کل لڑکیاں اپنے والدین پر بوجھ بنتی جا رہی ہیں۔ والدین بھی کیا کریں بے چارے۔ حالات سے تنگ آچکے ہیں احسن چچا کو بس یہی فکر لگی ہے کہ فرحین کے فرض سے سبک دوش ہو لیں تو چین کی سانس لیں۔ لیکن ہائے رے فرحین کی قسمت! ہر بار لڑکے والوں نے اسے ناپسند ہی کیا۔ یا تو جوڑے کی موٹی رقم اور جہیز کی فہرست اتنی طویل ہوتی کہ احسن چچا بس ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتے، یا پھر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر وہ

لوگ چلتے بنتے۔ اچھی خاصی تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ تھوڑا رنگ ہی سانولا ہے۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے، کیا لڑکی اپنے طور پر خدا سے حسن مانگ کر لائے' اور کوئی عیب نہیں فرحین میں۔ ان ہی باتوں کا وہ اتنا زیادہ اثر لیتی ہے کہ جذباتی ہو کر اپنا سارا غم و غصہ آئینے پر اتارتی ہے۔ بے چاری!" بات ختم کرتے کرتے زریں کا لہجہ بھی بھاری ہو چلا تھا اور اپنی سہیلی کی حالت پر اس کی پلکیں بھی نم ہو چلی تھیں!

زریں سے جب تفصیلات معلوم ہوئیں تو فرید کو بھی صدمہ ہوا کہ لوگ اتنے خود غرض کیوں بنتے جا رہے ہیں۔ شادی بیاہ بھی تجارت ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ جانے ایسی کتنی بدنصیب لڑکیاں ہوں گی جو فرحین کی طرح اپنے ارمانوں کو سینے میں دفن کئے سسک رہی ہوں گی۔ فرید نے تہیہ کر لیا کہ اگر خدا نے اسے کسی قابل بنایا اور موقع عطا کیا تو وہ ضرور فرحین کا غم دور کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس حساس لڑکی سے ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔

فرید اس سال انجینئرنگ کے آخری سال کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا فرحین کے بارے میں دو ایک ہمدردی کی باتیں اس نے زریں سے کہیں اور اٹھ کر اپنے اسٹڈی روم میں چلا گیا۔

وقت کا طائر پرواز کرتا رہا اور کچھ عرصہ یوں ہی بیت گیا۔ فرحین خوش تھی کہ اس کے لئے ان دنوں کوئی رشتہ کا چکر نہیں تھا وہ خدا کے حضور میں شکرانہ ادا کرتی کہ اس نے اس جہنم سے اسے بچائے رکھا ہے جس سے گزر کر اس کے احساسات جھلس جاتے ہیں۔

ادھر امتحان کے بعد فرید کا نتیجہ آچکا تھا اور وہ فرسٹ کلاس کے ساتھ کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے جلد ہی محکمہ تعمیرات میں جونیئر انجینئر کی جگہ مل گئی۔ پوسٹنگ بھی وطن ہی میں ملی۔ کچھ دن بعد جب اس کی شادی کا سلسلہ چھڑا تو اس نے زریں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ فرحین سے شادی کرے گا اور شادی گھوڑے جوڑے کے

بغیر ہو گی ۔ زرین اپنے بھائی کے اس اونچے خیال پر پھولی نہ سمائی اور بس دیکھتے ہی دیکھتے بات احسن چچا تک جا پہنچی اور پکی ہو گئی ۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ۔ گھر بیٹھے اتنے اونچے خیالات رکھنے والا لڑکا داماد بن رہا تھا ۔ یہاں پھر وہ قائل ہو گئے کہ خدا کے گھر دیر ہے، لیکن اندھیر نہیں ۔

فرید کی خواہش کے مطابق شادی سادگی سے، بغیر کسی شور شرابے کے انجام پائی ۔ براتیوں نے پلاو زردہ خوب خوب کھایا اور نئے جوڑے کو دعائیں دیں ۔ فرحین سرخ عروسی لبا میں وداع کر دی گئی ۔ چھوٹی موٹی رسموں سے چھٹکارا ملتے ہی اسے حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا ۔ کمرے میں چنبیلی اور موگرے کی کلیوں کی مہک مدہوش کن تھی ۔ کچھ لمحے انتظار کے گزرے اور پھر فرید حجلہ عروسی میں داخل ہوا ۔ اور جب اس نے اپنی دلہن کا گھونگٹ الٹ کر دیکھا تو بے اختیار وہ "ماشاء اللہ" کہہ اٹھا ۔ فرحین نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک فرید کی انگلیوں کا لمس محسوس کر کے ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی ۔ پھر اس کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا اور وہ بے تحاشا رونے لگی ۔ فرید نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی سسکیاں تھمنے ہی میں نہ آتی تھیں ۔ آخر جب غبار چھٹا تو اس نے فرید سے پوچھا "سچ سچ بتائیے ۔ آپ نے مجھ پر ترس کھا کر تو یہ شادی نہیں کی، کیوں کہ میں اتنی بدصورت ہوں کہ کسی نے بھی مجھے پسند نہیں کیا تھا ۔ لیکن آپ نے ...."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرید نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور کہا "فرحین، غالباً تم احساس کمتری کا شکار ہو ۔ تم سے کس نے کہا کہ تم بدصورت ہو دیکھو میری طرف، جس کی نظروں میں تم حوروں سے زیادہ خوبصورت اور مقدس ہو ۔ ویسے میرا پیمانہ حسن کچھ اور ہے میری نظروں میں وہ لڑکی سب سے زیادہ حسین ہے جس کا دل خوب صورت ہو، جس ... قربانی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو اور جو دوسروں کی تکلیف پر خود کراہ اٹھے ۔ اور میں

سمجھتا ہوں کہ میرا انتخاب غلط نہیں"۔ پھر اس نے فرحین سے پوچھا "تم ہی بتاؤ کہ کیا میرا انتخاب غلط ہے؟"

فرید کے سوال پر فرحین بس شرما کر رہ گئی۔ فرید کے خیالات جاننے کے بعد وہ خوشی سے جھوم اٹھی اور خیالوں ہی خیالوں میں اپنے مجازی خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اس کا دل نہ مانا تو اس نے کہا "تو وہ سارے آئینے جن کے سامنے بٹھا کر مجھے گھنٹوں سنوارا جاتا تھا، کیا وہ سب جھوٹے تھے؟"

"نہیں وہ جھوٹے نہیں، گونگے ہوں گے۔ وہ آئینے تمہارے اس سانولے سلونے حسن کی رعنائیوں میں کھو کر کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہتے ہوں گے۔ خیر چھوڑو ان گونگے آئینوں کا ذکر، ادھر دیکھو میری ان آنکھوں میں۔ تمہارے حسن نے تو انہیں خیرہ کر دیا ہے۔ دیکھو ان آنکھوں میں۔ یہ تمہارے حسن کا صحیح عکس تمہیں پیش کریں گی۔ آؤ آج نئی زندگی کی شروعات پر ہم عہد کریں کہ زندگی کی پر پیچ راہوں پر ہم ساتھ ساتھ، ہم قدم آگے بڑھیں گے"۔ پھر فرید نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا اور وہ چپ چاپ اس کے کشادہ سینے سے لگی خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی محسوس کرنے لگی۔ خوشی کے دو آنسو اس کے رخساروں کا سہارا لیتے ہوئے فرید کے سینے پر اگے بالوں کے گھنے جنگل میں جذب ہو گئے۔

نوید سحر

رفیعہ خانم بڑے ہی تمکنت اور محبت آمیز لہجے میں اپنی بھاوج سے مخاطب تھیں۔ قمر جہاں اب مجھے نامراد مت لوٹانا میری جھولی خالی مت رکھنا میری تمیز بیٹیا کو میری جھولی میں ڈال دو۔ یہی میری خواہش ہے اور یہی نعمان کی آرزو بھی تمیز ہی نعمان کی تمنا ہے خدا کے لئے نا مت کرنا میری تم سے یہی التجا ہے۔"

" ٹھیک ہے آپا بیگم مجھے کچھ مہلت دیں میں سوچ کر بتاؤں گی اور پھر مجھے تمیز کی مرضی بھی تو معلوم کرنی ہوگی۔ قمر جہاں نے رفیعہ خانم کی بات رکھتے ہوئے جواب دیا۔ لو بیگم یہ آج کل لڑکیوں کی مرضی بھی معلوم کرنی پڑے گی توبہ کیا زمانہ آگیا ہے اسی لئے تو بزرگ کہا کرتے ہیں کہ قیامت قریب ہے ایک ہمارا زمانہ تھا کہ لڑکی کو والدین گائے بھینس کی طرح جس کھونٹے سے باندھ دیں بندھ جاتی تھیں۔ نہ مرضی کا مسئلہ درپیش ہوتا نہ ہی لڑکی زبان کھولنے کی ہمت کرتی۔ ویسے بھی قمر جہاں میں پوچھتی ہوں میرے نعمان میں تجھے کچھ کمی، کچھ خرابی نظر آتی ہے اس میں بھلا سوچ کر بتانے کی ضرورت کیا ہے۔ لڑکا، خاندان سب کچھ جانا بوجھا ہے تمہیں پریشانی کس بات کی ہے جو تم یوں کہہ رہی ہو۔" رفیعہ خانم نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ تو قمر جہاں کچھ دیر سوچ میں کھو گئیں اور پھر اپنی تمام تر ہمتیں یکجا کر کے بولیں۔ "آپا بیگم آپ تو جانتی ہی ہیں کہ آپ کے بھائی کے مرنے کے بعد اس گھر کی ساری ذمہ داری تمیز نے ہی اپنے سر لے رکھی ہے نوید ابھی بہت چھوٹا تھا کہ اس کے ابو چل بسے پھر کسی نے ہماری خبر نہ لی۔ ان حالات میں اگر تمیز نے میری ہمت نہ بندھائی ہوتی تو میں بھی آپ کے بھائی سے جا ملی ہوتی اب تمیز کی شادی کا مسئلہ ہے تو بھلا میں اس کی مرضی معلوم کیے بغیر تو کوئی قدم اٹھا نہیں سکتی

آپ مجھے کچھ مہلت ضرور دیں انہوں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ دراصل رفیعہ خانم قمر جہاں کی بڑی نند تھیں اور وہ ان سے بہت خوف بھی کھاتی تھیں لیکن بات جب تمیز کی شادی کی آئی تو انہوں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا۔

"ہاں ٹھیک ہے سوچ کر ہی جواب دو۔ لیکن ایک بات ضرور یاد رکھنا کہ تمیز پر پہلا حق نعمان کا ہے کوئی فیصلہ کرنے سے قبل یہ بات ضرور دھیان میں رکھنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ انہوں نے بھی دبے دبے لہجے میں قمر جہاں کو آگاہ کیا اور اپنی چادر سمیٹتے ہوئے واپس جانے لگیں۔

" ارے آپا بیگم چائے تو پیتی جائیں "۔ قمر جہاں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکی نہیں اور اپنی راہ لی۔

جب نند اور بھاوج کی یہ گفتگو تمیز کی سماعت سے ٹکرائی جو کہ ساتھ والے اپنے کمرے میں بستر پر دراز کسی رسالے کے مطالعہ میں غرق تھی تو یک بیک چونک کر اٹھ بیٹھی اور اپنی تمام تر توجہ ان میں ہونے والی گفتگو کی طرف مبذول کر دی۔ جب وہ ساری باتیں سن چکی اور جب اس کی بڑی پھوپھی رفیعہ خانم جا چکیں تو اس پر غم و غصہ کی لہر چھا گئی پھر وہ دندناتی ہوئی کمرے سے باہر دالان میں آپہنچی جہاں اس کی ماں قمر جہاں اپنا ہاتھ سر کو لگائے کسی خاص سوچ میں گم تھیں۔ وہ بھڑک اٹھی۔ امی جان یہ پھوپھی جان کی محبت اب کیوں جاگ پڑی ہے قمر جہاں مجھے نامراد مت لوٹانا میری جھولی میں تمیز بیٹیا کو ڈال دو۔ یہی میری خواہش ہے اور یہی نعمان کی تمنا بھی۔ اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ تو قمر جہاں اپنی سوچوں سے واپس لوٹیں اور تمیز کو ڈانٹ کر کہا یہ کیا کہہ رہی ہو بھلا اس طرح بھی بزرگوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ نہیں بیٹیا یہ بہت بری بات ہے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں"

وہ سب تو ٹھیک ہے امی لیکن میں کہے دیتی ہوں کہ میں اس گھر میں نہیں

جاؤں گی نہ ہی مجھے پھوپھو جان پسند ہیں اور نہ ہی نعمان بھائی کیا آپ سب کچھ بھول گئی ہیں۔ کچھ بھی نہیں یاد آپ کو ..... میں پوچھتی ہوں ان کی یہ محبت اس وقت کہاں جا سوئی تھی جب ان کا بھائی گزر چکا تھا۔ بھاوج بھتیجی اور بھتیجہ کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہے تھے انہیں جب مدد کی ضرورت تھی تب وہ کہاں تھیں اس نے تڑپ کر کہا تو اس کی آواز بھاری ہو چلی تھی اور آنکھیں جل تھل ہونے لگی تھیں

ہاں بیٹی مجھے سب کچھ یاد ہے بھلا وہ دن میں کیسے بھول پاؤں گی۔ میرے سینے میں ہر بات اور ہر پل پتھر کی لکیر کی طرح کندہ ہیں۔ قمر جہاں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ تم کچھ غم نہ کرو میں کسی طرح تمہاری پھوپھی کو ٹال جاؤں گی" انہوں نے اسے ڈھارس بندھائی تو وہ پھر اپنے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر دراز ہو کر رسالہ کے مطالعہ میں خود کو گم کرنا چاہا۔ لیکن اب اس کا دل کسی بھی تحریر میں نہ لگ سکا کیونکہ رہ رہ کر ماضی کے اوراق پھڑپھڑانے لگے تھے۔ اور وہ ان میں الجھتی جا رہی تھی۔

رفیعہ خانم اور شفیعہ خانم دو بہنیں بڑی تھیں ناصر اور نادر دو بھائی چھوٹے تھے تب ہی دونوں بہنیں بیاہ دی گئی تھیں نادر جب گریجویشن میں تھے اور ناصر کی شادی ہوئے کوئی ایک سال ہوا ہوگا ان کے والدین بیت اللہ کی زیارت کو جو گئے تو واپس لوٹنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا اور جنت البقیع میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ کیا مبارک موت تھی کہ مقدس سرزمین نصیب ہوئی۔ یہ تمام تفصیل اسے اس وقت معلوم ہوئی جب تمیز نے اپنی ماں سے اپنے دادا دادی کے بارے میں دریافت کیا تھا تب اس کی امی نے اسے ان باتوں کی آگاہی دیتے ہوئے کہا تھا تمہاری دادی اماں اور دادا جان بہت نیک صفت اور رحم دل ہوا کرتے تھے۔ اپنے وقت کے جاگیردار رہ چکے تھے۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری

کرتے کبھی کسی کو خالی ہاتھ لوٹتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا تم بدقسمت ہو تمیز بیٹی جو کہ ان کی محبت سے محروم رہیں ۔ انہوں نے اپنی ساڑی کے آنچل سے اپنی نم ہوتی آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا ۔

" مجھے تو انہوں نے کبھی بہو نہیں سمجھا تھا ۔ بیٹی سے بڑھ کر پیار کرتے تھے ۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور جنت میں ان کے درجات بلند کرے ۔

ماں باپ کے گزر جانے کے بعد ناصر خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے تھے کیونکہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے ان کی ذرا کم ہی نبھتی تھی دونوں ہی بہنوں کے مزاجوں میں بلا کی تیزی تھی ۔ حالانکہ ان کی ماں ایک انتہائی رحم دل اور نیک صفت خاتون تھیں ۔ لیکن ان کی بہنوں کے مزاج ماں کے مزاج سے بالکل برعکس پائے گئے تھے ان کے مزاجوں میں یہ عنصر کہاں سے آیا تھا ۔ قیاس کرنا مشکل تھا چنانچہ ناصر نے یہی مناسب سمجھا کہ بہنوں سے زیادہ روابط نہ ہی رکھیں تو بہتر رہے گا یہ کہاوت کسی حد تک ٹھیک ہی ثابت ہوئی تھی کہ رشتہ داری میں جتنی دوری روا رکھی جائے اتنی محبت بڑھتی ہے ۔ چنانچہ عید یا کسی شادی بیاہ کی تقریب ہی میں یہ بھائی بہن اور بھاوج آپس میں مل لیا کرتے اور ہنس بول لیتے کبھی کوئی خاص موقع ہوتا تو ہی ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے ۔ آپس میں دوری روا رکھنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ رفیعہ خانم اور شفیعہ خانم دونوں ہی کافی دولت مند گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں اور ناصر ایک ملازم پیشہ آدمی تھے ۔ محکمہ مالیات میں معمولی منتظم وہ اگر چاہتے تو ناجائز آمدنی سے اپنی آن بان بھی بڑھا سکتے تھے ۔ لیکن وہ ایک اصول پسند اور ایماندار آدمی تھے ۔ اپنی تنخواہ ہی میں گھر کا خرچ پورا ہو جاتا تھا چونکہ قمر جہاں بھی ایک سگھڑ اور کفایت شعار عورت تھیں اسی لئے گھر کو جنت کا نمونہ بنایا ہوا تھا ۔ شوہر کی رضا میں اپنی خوشی سمجھتی تھیں اور جہاں تک ممکن ہو سکا اپنی ماہانہ آمدنی سے کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کر لیا کرتیں دونوں میاں بیوی میں بے

انتہا سمجھ بوجھ تھی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ان کی زندگی قابل رشک تھی اور حاصل سبق بھی ان کے چمن زندگی میں خدا نے دو پھول کھلائے تھے بڑی تمیز تھی اور چھوٹا نوید وہ دونوں بے حد مسرور زندگی گزار رہے تھے لیکن نجانے کیوں ان کی بڑی بہن رفیعہ خانم کو اپنی بھاوج قمر جہاں سے زمانے بھر کا بیر تھا وہ ان کے نام سے بلا کا خار کھاتی تھیں۔ جب کبھی موقع ملتا ان کے خلاف اپنے بھائی کو بھڑکانے سے باز نہ آتی تھیں۔ لیکن ناصر بڑے ہی صبر و تحمل سے ان کی باتیں سنتے اور پھر بعد میں انہیں بھول جاتے۔ انہیں اپنی بہن کی فطرت کا بخوبی اندازہ تھا۔ چھوٹی بہن شفیعہ خانم گو کہ وہ بھی تنک مزاج ضرور تھیں لیکن ان کی فطرت میں حسد اور جلن نام کی شئے تھی ہی نہیں وہ اپنے بھائی کے روشن مستقبل اور مسرور زندگی دیکھ کر بے حد خوش ہوتی تھیں اور کھلے عام اپنی بھاوج کی تعریف کرنے سے باز نہ آتیں۔ وہ اکثر اپنی بھاوج قمر جہاں کے گلے میں بانہیں ڈالے کہتیں۔

بھابی واقعی تم نے میرے بھائی کے گھر کو جنت کا نمونہ بنادیا ہے۔ میرا بھائی واقعی خوش نصیب ہے جسے تم جیسی جیون ساتھی ملی ہے"۔

"لو بھلا میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تم یوں کہہ رہی ہو"۔ وہ مسکراتی ہوئی کہتیں۔ "دیکھو بی آپا عورت اگر چاہے تو اس کا گھر جنت بھی بن سکتا ہے یا پھر جہنم اگر عورت شوہر کی آمدنی کے حساب سے اپنے اخراجات کا تعین کرے اور گھریلو ضرورتوں پر اپنی خواہشات قربان کرے تو ہر گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ میں نے تو وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ تھوڑی سی اپنی خواہشات کو مٹادیا اور غیر ضروری فرمائشوں سے پرہیز کیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے شوہر کی آمدنی کے حساب سے اپنی ضرورتوں کی تکمیل کی بس یہی چند باتیں ہیں جن پر میں عمل پیرا ہوں۔ جس کے نتیجہ میں آپ دیکھ رہی ہیں کہ ہماری زندگی میں سکون اور اطمینان ہے آپ بس یہی دعا کرتے رہیں کہ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے۔ قمر جہاں

خدا کی مشکور ہوتی ہوئی بولیں۔

"ہاں بھابھی مجھے آپ کی یہی باتیں بے حد پسند ہیں تبھی تو میں کھلے عام آپ کی تعریف کرنے سے گریز نہیں کرتی خدا سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کے چمن زندگی کو ہمیشہ بہار ہی بہار عطا کرے اور اسے نظر بد سے بچائے آمین وہ بے حد خوشی اور جذباتی لہجے میں کہتیں۔

والدین کے بعد ناصر پر نادر کی ذمہ داری تھی سو وہ بھی انہوں نے بخوبی نبھائی نادر نے گریجویشن کے بعد کمپیوٹر سائینس میں ڈگری حاصل کی اور خلیجی ممالک چلا گیا جب چند سال کے بعد واپس لوٹا تو ایک مناسب خاندان میں اس کی شادی کر دی۔ پھر نادر نے فیملی ویزا حاصل کیا اور بیوی کو اپنے پاس بلالیا وہ دونوں اب ریاض (سعودی عرب) میں مقیم تھے۔شادی کے بعد نادر میں ایک غیر معمولی تبدیلی یہ آئی کہ وہ بڑے بھائی بھاوج اور بہنوں کو یکسر بھلا بیٹھا۔ کبھی کبھار کوئی خیریت کی اطلاع آجاتی اور بس۔ناصر یہ کہہ کر چپ رہ جاتے کہ وہ جہاں رہے خیریت سے رہے خوش رہے بس، ہمیں اس سے اور کیا چاہیے۔

وقت کی سوئی آگے بڑھتی رہی۔دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔موسم بدلے رتیں بدلیں۔آب و ہوا میں تغیر ہوتا رہا کبھی موسم بہار رہا تو کبھی خزاں نے اپنا ڈیرہ جمایا۔ناصر اور قمر جہاں نے بھی اپنی زندگی کی کئی بہاریں اور کئی خزائیں دیکھ ڈالیں دونوں اپنی زندگی کی منزلیں بتدریج طے کرتے رہے کل کے بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ تمیز ہایر سکنڈیری امتحان اعلیٰ نمبرات سے کامیاب کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے چکی تھی اور نوید اب ایس ایس سی میں آچکا تھا دونوں ہی تعلیم کے معاملے میں آگے تھے ذہین تھے اپنی اپنی جماعتوں کے ذہین طلباء میں ان کا شمار ہوا کرتا۔

کہتے ہیں زندگی اتار چڑھاؤ اور حادثوں کا نام ہے قمر جہاں اور ناصر کی زندگی

ایک ہی ڈگر پر آرام سے چل رہی تھی کہ اچانک ان کی زندگی میں بھونچال آگیا۔ ان کے چمن زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ اور آن واحد میں ان کی زندگی کی ساری بہاریں ان سے روٹھ کر چلی گئیں۔ اچانک ہی اچھے بھلے چنگے ناصر پر دل کا دورہ پڑا اور جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ سارے اپنوں کو تنہا چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ قمر جہاں کی زندگی اجڑ کر رہ گئی بیوگی کا داغ انکی روشن جبیں پر ہمیشہ کے لئے لگ گیا اس ساری کائنات میں ناصر ہی ان کے سب کچھ تھے وہ اپنے والدین کی تنہا اولاد تھیں نہ کوئی بھائی نہ بہن ان کے والدین کے بعد ان کے ماموں ہی ایک واحد سہارا تھا ان کے لئے۔ اب تو وہ بھی اس دنیا میں نہ رہے تھے۔

قمر جہاں خود کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگیں دونوں بچے تمیز اور نوید ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ ناصر چل بسے اب ان کی واحد آمدنی ناصر کے بعد ان کا وظیفہ رہ گیا تھا لیکن تمیز نے جو ایک باہمت لڑکی تھی اپنی ماں کے بکھرتے وجود کو سنبھالا دیا اور کہا امی آپ پریشان نہ ہوں اللہ نے ہر مصیبت کے بعد راحت رکھا ہے۔ ہر برے دن کبھی نہ کبھی اچھے دنوں میں بدل جاتے ہیں چھاؤں کے بعد، دھوپ اور بہار کے بعد خزاں ضرور آتی ہے یہی تو نظام قدرت ہے۔ ابو چلے گئے تو کیا ہوا! انہوں نے ہم دونوں کو آپ کے لئے چھوڑا ہے۔ آپ ہمت سے کام لیں۔ کسی کے آگے ہمیں ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت پڑی تو میں ٹیوشن کرلوں گی نوید کو آگے پڑھاؤں گی۔ آپ ذرا بھی ہمت نہ ہاریں اللہ رحم کرنے والا ہے"۔

"اللہ تمہاری مدد کرے بیٹی۔ تمہاری ان حوصلہ افزاء باتوں سے مجھ میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کی ہمت آگئی ہے خدا تمہیں ہر ہر امتحان میں کامیاب کرے اور ہر ہر منزل آسان کرے"۔ قمر جہاں نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

تمیز نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا۔ گھر پر ہی اس نے پرائمری اور اپر پرائمری کلاسس کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ بہت ہی کم عرصے میں وہ ایک

قابل ٹیچر کی حیثیت سے مشہور ہو گئی اور بچوں کی تعداد دن بہ دن بڑھنے لگی اب اس نے دو دو وقت پڑھانا شروع کر دیا صبح اور شام صبح دس بجے سے شام تین بجے تک وہ خود کالج جایا کرتی۔ اب وہ گریجویشن کے آخری سال کی طالبہ تھی اس نے اپنا ایک پروگرام مرتب کیا ہوا تھا وہ پہلے بی کام کرے گی پھر کسی بینک کے مقابلے کے امتحان میں حصہ لے گی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو بینک ملازمت کرے گی اور پھر وقت نے مہلت دیا تو پوسٹ گریجویشن بھی کرے گی ادھر نوید کو انٹرمیڈیٹ کے بعد اس نے انجینئرنگ میں داخلے کے امتحان کی تیاری میں لگادیا تھا۔

کہتے ہیں اگر لگن سچی ہو اور آدمی محنت کرے تو اللہ بھی اسے پسند فرماتا ہے اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کر دیتا ہے تمیز کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اس نے بی کام درجہ اول میں کامیاب کیا اور بینک کے مقابلے کے امتحان کی تیاری میں جٹ گئی اس کے ایک استاد فاروقی انکل نے اس کی بہت مدد کی اور اپنا پورا پورا وقت دیا اور اسے امتحان کے لئے تیار کروایا اور پھر اللہ کی مدد بھی شامل حال تھی۔ چنانچہ بینک کے اس امتحان میں اس نے بازی مار لی اور سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ ان دنوں ہرشد مہتا اسکینڈل بہت زوروں پر تھا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر اسی اسکینڈل کی خبریں جلی حرفوں میں شائع ہو رہی تھیں۔ اور فاروقی انکل کا یہ گیس تھا کہ اس امتحان میں اس اسکینڈل پر ضرور سوال آئیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس نے سارا پرچہ بڑی خوبی سے حل کر لیا۔ زبانی امتحان میں بھی اسی اسکینڈل پر سوال پوچھے گئے تو اس نے اس خوبی سے جواب دیا کہ ممتحن خود حیران رہ گئے اور بے اختیار اسے شاباشی دینے لگے اور ساتھ ہی انہوں نے جب مسکراتے ہوئے اور اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا مس تمیز مبارک ہو آپ کا انتخاب ہو چکا ہے آرڈرس کا انتظار کیجئے اور ٹریننگ کے لئے تیار رہیے تو جیسے اسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو وہ خوشی سے سرشار ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے خوشی کے ان لمحات

میں بھی وہ رو دی یہ آنسو تو خوشی کے تھے۔ وہ جب گھر لوٹ رہی تھی تو رہ رہ کر اسے اپنے ابو یاد آرہے تھے کاش آج ابو زندہ ہوتے تو اس کی اس کامیابی پر بے انتہا خوش ہوتے جشن مناتے وہ تو خوشی سے سرشار گھر میں داخل ہوئی اور امی امی کہتی ہوئی قمر جہاں کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول گئی وہ پریشان پریشان سی اسے تکنے لگیں ۔ کیا ہوا بیٹی کیوں اتنی بدحواس ہوئی جارہی ہو" ۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا

امی ایک بہت ہی اچھی خبر ہے تمہاری بیٹی آج بینک کے امتحان میں کامیاب ہو گئی اور اسے منتخب کر لیا گیا ہے بہت جلد ملازمت کا پروانہ اسے مل جائے گا وہ خوشی میں جھومتی ہوئی قمر جہاں کو بتانے لگی۔

" سچ بیٹی تمہیں بے حد مبارک ہو بے شک اللہ تعالیٰ کسی کی بھی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا بشرطیکہ اس پر پورا بھروسہ کریں" ۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تمیز کا چہرہ تھام لیا ۔ اور مہر محبت اس کی پیشانی پر ثبت کر دی پھر وہ تفصیلات معلوم کرنے لگیں کہ جملہ کتنے امیدوار مقابلہ کے امتحان میں تھے ۔ کتنی لڑکیوں نے امتحان دیا کتنے لڑکے اس امتحان میں بیٹھے تھے وغیرہ وغیرہ ..... پھر جب تمیز نے انہیں بتایا کہ کوئی چار سو امیدواروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کیا ہے تو بے حد خوش ہوئیں اور خدا کے حضور سربسجود ہو کر شکر بجالائیں ۔

ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ تمیز کو ٹریننگ کے لئے بلاوا آگیا کل چھ ماہ کی ٹریننگ تھی جس کے لئے اسے اپنا وطن نظام آباد چھوڑ کر حیدرآباد جانا پڑا ان دنوں وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹریننگ بھی مکمل ہو گئی اور اسے اپنے ہی وطن میں پوسٹنگ دے دی گئی ۔ حیدرآباد میں ٹریننگ کے دوران اس کی ملاقات یک بہت ذہین اور خوبرو نوجوان سے ہوئی عامر نام تھا اس کا بہت ہی سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا ٹریننگ کلاس میں اکثر ان دونوں کی نشستیں ایک دوسرے کے

قریب ہوتیں۔ جب وہ نظریں چرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے اور کبھی ایک دوسرے کی چوری پکڑے جانے پر شرم سار بھی ہو جاتے ایک دن عامر نے ہمت کی اور اس سے مخاطب ہوا۔

"مس تمیز میں بہت دنوں سے آپ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہوں لیکن ڈر بھی رہا ہوں کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں عامر نے بہت ہی نپے تلے لہجے میں کہا تو تمیز نے از راہ اخلاق جواب دیا۔

"کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ کوئی پرابلم ہو تو بتائیں اگر میرے بس کی بات ہو تو ضرور حل کر لوں گی"۔

"دراصل بات یوں ہے کہ آپ مجھے بے حد پسند آ گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں اگر آپ میری زندگی کی ساتھی اور ہمسفر بن جائیں تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا عامر نے براہ راست اپنا مدعا بیان کر دیا۔

"عامر صاحب آپ تو بہت جلد باز نکلے۔ میں کون ہوں کہاں کی رہنے والی ہوں میرے والدین کون ہیں اور پھر آپ کی اور میری ملاقات کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے آپ نے مجھے پوری طرح جانا بھی نہیں اور پروپوز کر دیا"۔ تمیز نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مس تمیز ہماری ٹریننگ کے پہلے دن ہی تو ہم سب نے اپنا اپنا انٹروڈکشن دے دیا تھا اور پھر آپ کا سب سے بڑا تعارف تو میرے لئے آپ کی بردباری، رزرو رہنے والی عادت اور آپ کی ذہانت ہے۔ یقیناً آپ ایک بہت قابل اور نیک صفت والدین کی بیٹی ہیں جنہیں آپ پر ناز ہوگا۔ آپ کی اعلیٰ ظرفی آپ کے چہرے سے ٹپکتی ہے۔ آپ کے چہرے کی معصومیت آپ کی پاکیزگی کی علامت ہے اور میں ان ہی باتوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ اب میری نیندیں میری نہیں رہیں۔ میرے خوابوں اور خیالوں پر آپ کا قبضہ ہے ہر لمحہ ہر پل میرے تصور میں آپ ہی کی تصویر رقص

کناں ہے۔ ان سب باتوں کو اگر کوئی عنوان دیا جائے تو وہ یہی ہوگا محبت ہاں مس تمیز مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" عامر نے اپنے دل کی بات بالآخر اس سے کہہ ہی ڈالی۔

اپنی تعریف ایک خوبرو نوجوان سے سن کر ہر لڑکی خوش ہوجاتی ہے لیکن تمیز ان لڑکیوں میں سے نہ تھی اس نے عامر کی باتوں کو بغور سنا اس کے چہرے پر بھی شفق کی سی لالی ابھر آئی وہ بھی شرم و حیا سے ڈوب ڈوب گئی لیکن اس نے عامر سے کہا" مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں ایک اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن عامر صاحب میرے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہے جب تک میں انہیں پورا نہ کرلوں اپنے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ دراصل میرے ابو وفات پاگئے ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی انجینرنگ کے دوسرے سال میں پڑھ رہا ہے اور جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرلے اور اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوجائے میں شادی نہیں کرسکتی"۔ تمیز نے اپنی مجبوری بیان کی تو وہ مسکرا پڑا اور کہنے لگا تو یوں کہیے آپ اور ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں چلیے میں بھی آپ کو بتا ہی دوں کہ میرے ابو بھی نہیں ہیں۔ ماں ہیں اور ایک چھوٹی بہن جو ابھی پڑھ رہی ہے میں نے بھی اسے اعلیٰ تعلیم دلانے کی ٹھانی ہوئی ہے اور اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے آپ کا ساتھ نصیب ہوجائے تو ہم دونوں مل کر اپنی کشتی حیات کو انشاء اللہ بآسانی ساحل تک کھینچ لائیں گے۔ کہیے اس کار خیر میں میں آپ کا ساتھ دوں گا اور آپ میرا...... منظور ہے۔ عامر نے جب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ بے بس ہو گئی اس کی آنکھوں میں اس کے لئے پیار کے ہزاروں دیپ روشن تھے اور محبت کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا ایک انجانے جذبے کے زیر اثر اس نے اپنے نازک ہاتھ عامر کے مضبوط ہاتھوں میں تھمادیے جنہیں تھام کر وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور اپنی مہر محبت ان نازک نازک ہاتھوں پر

ثبت کر دی۔

ٹریننگ کے دوران وہ دونوں بہت قریب آ گئے تھے ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانا ایک دوسرے کی خواہش کا احترام کیا۔ کسی دن عامر کہتا کہ آج گلابی ڈریس پہنو تو وہ وہی لباس پہنتی کسی دن ساڑھی پہن کر آنے کی فرمائش کی تو کسی دن پنجابی سوٹ! وہ اس کی ہر آرزو ہر خواہش کا احترام کرتی۔ وہ بھی تو خود کو جیسے مکمل طور پر تمیز کی مرضی پر ڈھالنے لگا تھا۔ تمیز کہتی کہ سفید پینٹ پر نیلے رنگ کی قمیص تمہیں بہت جچتی ہے تو وہ وہی پہن کر آتا اس کا رنگ اتنا صاف اور کھلتا ہوا تھا کہ وہ واقعی کسی راج کمار سے کم نہ لگتا تھا۔ اور تمیز آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر نثار ہوئی جاتی اس کی بلائیں لیتی اور دل ہی دل میں نظر بد سے بچائے رکھنے کی دعا مانگتی۔ اسی دوران ایک دن عامر اسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی ماں رئیسہ بیگم سے ملوایا۔ امی جان دیکھو کون آیا ہے۔ عامر نے تمیز کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر ورانڈے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اس کی ماں ایک درمیانہ عمر کی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ تمیز نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے انہیں بہت احترام سے سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی بڑی عمر پاؤ انہوں نے اسے دعائیں دیں اور کہا"۔ عامر نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے بیٹی مجھے بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ اپنے ابو کی موت کے بعد تم نے جس ہمت اور حوصلے سے کام کیا اور آج یہاں تک پہنچی ہو یقیناً قابل تعریف و تقلید ہے خدا تمہیں ضرور اجر دے گا۔ تمہاری ماں بہت خوش قسمت ہیں جنہوں نے تم جیسی ہونہار اولاد پائی۔ عامر کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں کی ٹریننگ اگلے ہفتہ ختم ہو رہی ہے۔ میں تمہارے وطن آکر تمہاری امی سے ملوں گی اور باضابطہ تمہارا ہاتھ مانگوں گی۔ عامر کی امی اس پر آنکھوں ہی آنکھوں میں نثار ہوتی ہوئی بولیں۔ پھر تمیز ان کے ہمراہ کچن تک گئی اور اپنے ہاتھوں سے چائے اور

ناشتہ بنا کر کشتی میں سجا کر لائی۔ عامر کہتا ہی رہ گیا کہ کیوں تکلیف کر رہی ہو۔ لیکن جب دل ملتے ہیں تکلفات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پھر تینوں نے مل کر گرم گرم پکوڑے کھائے اور چائے نوش کی اور پھر تمیز ان سے اجازت طلب کر کے ہاسٹل چلی آئی۔ عامر بھی اسے چھوڑنے ہاسٹل تک چلا آیا تھا راستے بھر وہ دونوں مستقبل کے سہانے خواب میں کھوئے رہے تھے۔

ٹریننگ کے آخری دن اختتامی تقریب تھی اسی دن شام میں عامر نے تمیز کو بڑے اصرار سے ڈنر پر بلایا تھا۔ وہ انکار کرتی رہی لیکن عامر کے اصرار پر اسے ہاں کرتے ہی بنی اس نے نہ صرف ڈنر پر بلایا تھا بلکہ فرمائش بھی کی تھی کہ وہ آج شام نیلا پنجابی سوٹ پہنے گی چنانچہ اس نے عامر کی خواہش کے احترام میں نیلے رنگ کا سوٹ زیب تن کیا۔ ہلکے سے میک اپ کے بعد وہ بہت نکھر گئی تھی۔ اس کا خداداد حسن ویسے تو کسی میک اپ کا محتاج نہ تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ دراز زلفیں، ستواں ناک اور نازک پتلے لب جنہیں دیکھنے پر گلاب کی پنکھڑیاں بے اختیار یاد آجاتیں اس حسن پر سادگی اور سنجیدگی کی دبیز چادر وہ جو ہمیشہ اپنے چہرے پر تانے رکھتی تو اس کے حسن پر چار چاند لگا دیتی حسب پروگرام وہ تیار ہو کر عامر کا انتظار کرنے لگی جب عامر آگیا تو وہ دونوں نکل پڑے پہلے انہوں نے ٹینک بنڈ کی سیر کی۔ ٹینک بنڈ کی ریلنگ سے کچھ دور پر کچھ کچھ فاصلے پر بنچس بٹھائی گئی تھیں جن پر اکثر جوڑے بیٹھے ڈوبتے سورج کے منظر سے لطف اندوز ہوتے وہ دونوں بھی ایک خالی بنچ پر جا بیٹھے دور تک پھیلے ہوئے حسین ساگر جھیل کے دوسرے کنارے پر چند کشتیاں چل رہی تھیں ابھی ابھی سورج اپنا دن بھر کا طویل سفر مکمل کر کے کائنات پر الوداعی کرنیں ڈال رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج دور تک پھیلے ہوئے حسین ساگر جھیل کے دوسرے کنارے پر ڈوب رہا ہو۔ ڈوبتے سورج کی سرخ کرنیں جب تمیز کے نکھرے نکھرے چہرے پر پڑنے لگیں تو اس کا حسن اور

دو بالا ہو گیا۔ عامر بغور اسے تکتا جا رہا تھا پھر اس نے تمیز کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور کہنے لگا۔ "تمیز! اگر تم میری زندگی میں آجاؤ گی تو میں اسے قدرت کا ایک حسین انعام اور انمول تحفہ سمجھوں گا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں کہیں کا نہ رہ پاؤں گا اس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش پنہاں تھی۔

"نہیں عامر ایسا مت سوچو۔ جذبے جب پاک ہوں اور محبت بے لوث ہو تو اللہ تعالیٰ کبھی اسے رائیگاں نہیں کرتا انہیں ضرور انعام سے نوازتا ہے۔ خدا کی رحمت سے ہمیں کبھی نا امید نہ ہونا چاہیے"۔ تمیز نے عامر کے لہجے میں چھپی مایوسی کو محسوس کر کے کہا تو عامر کھل اٹھا۔ "بے شک بے شک ہماری محبت بے لوث ہے ہمارے جذبے پاک ہیں اور مجھے امید ہے کہ خدائے تعالیٰ ہمیں ضرور انعام سے نوازے گا عامر نے جب کہا تو تمیز اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر آمین کہنے لگی۔ جو اس کے دل کے نہاں خانوں سے نکلی ہوئی آواز تھی اور شاید اس کے زیر اثر اس کی آنکھوں پر پھیلے غلافی پلکوں کے کناروں پر شبنمی قطرے جمع ہو گئے تھے جنہیں وہ کمال ضبط سے پی گئی تھی۔

شام جب ڈھلنے لگی اور رات کی سیاہی آہستہ آہستہ نیلگوں آسمان کو اپنے لپیٹے میں لینے لگی تو وہ دونوں وہاں سے نکل پڑے اب ان کا رخ ہوٹل سویرا کی جانب تھا۔ جہاں عامر نے ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ ہوٹل سویرا سکندر آباد کے ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں پر چہل پہل کچھ کم ہوا کرتی تھی یہ علاقہ نسبتاً کچھ پر سکون ہوا کرتا تھا۔ ہوٹل کے اندر کا ماحول بھی نہایت پر سکون تھا۔ عامر نے ایک کونے والی میز بک کروائی تھی۔ دبیز قالین سارے ہال میں پھیلا ہوا تھا ہال کے ایک جانب اسٹیج سا بنا ہوا تھا جہاں آرکسٹرا اور میوزیکل انسٹرومنٹس سجے ہوئے تھے یہاں ہر رات کوئی نہ کوئی میوزیکل پروگرام ہوا کرتا اور آج کا اسپیشل پروگرام تھا" محفل غزل" جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا خالی میزیں پر ہوتی گئیں اکثر میزوں پر جوڑے ہی تھے ماحول بڑا دلکش ہوتا جا رہا تھا۔ ریشمی آنچلوں کی سرسراہٹ اور پرفیومس کی خوشبو سے سارا ہال معطر ہو رہا تھا۔ بغل

کی میز ایک فیملی کی تھی ۔ جہاں میاں بیوی اور گول مٹول خوبصورت بچے چہک رہے تھے جو میز عامر نے بک کروائی تھی اس سے ملحقہ میزیں بیشتر خالی ہی تھیں ۔ چنانچہ رستوران کا وہ حصہ بڑا پرسکون تھا ۔ بیرے مطلوبہ ڈشس سے میزیں سجانے میں جتے تھے اور ہمہ اقسام کی ڈشوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو سارے رستوران میں پھیلی جارہی تھی ۔ عامر نے تندوری چکن پراٹھہ ، ٹماٹر کری فرائیڈ رائس اور ساتھ میں خوبانی کے میٹھے کا آرڈر دیا ہوا تھا ۔ جب ان کی میز مطلوبہ چیزوں سے سجادی گئی تو تمیز کہنے لگی ۔

عامر تم نے تو حد کر دی ۔ بھلا اتنی ساری چیزیں آرڈر کرنے کی کیا سوجھی تھی"

" یہ اتنی ساری کہاں سے ہو گئیں صرف دو تین ڈشیں ہی تو ہیں ۔ اب بھلا تمہارے لئے اتنا بھی نہ کروں تو لعنت ہے مجھ پر ۔ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" دراصل میں ان فضولیات کی عادی نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے فضول خرچی پسند ہے " ۔ تمیز نے جواب میں کہا تو عامر ہنسنے لگے اور بولے " محترمہ میں خود بھی اسی مزاج کا مالک ہوں تم یقین کرو تمیز یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس رستوران میں داخل ہوا ہوں یہ تو بس تمہارے لئے اہتمام ہے ۔ کل تو تم جارہی ہو اور نجانے ہماری ملاقات پھر کب ہو اسی لئے سوچا کہ جدائی کے یہ لمحے ہم دونوں ہی کے لئے کیوں نہ یادگار بن جائیں ۔ چلو اب باتیں بہت ہو چکی ہیں کھانا شروع کرو " ۔

عامر کی باتیں سن کر تمیز کے ہونٹوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ رقص کرنے لگی وہ دونوں آہستہ آہستہ کھانے لگے ۔ درمیان میں کچھ بات بھی کرلیتے کچھ دیر بعد مائک پر اناونسر کی آواز ابھری وہ کہہ رہا تھا ۔ خواتین و حضرات آج کی رات جو پروگرام ہم نے آپ کے لئے مرتب کیا ہے اسے ہم نے نام دیا ہے " محفل غزل " تو آیئے سنتے ہیں کچھ دلکش و دلنواز غزلیں جسے سن کر جوان دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں ۔ آج کے فنکار آپ ہی کے شہر کی جانی مانی ہستیاں ہیں جو تعارف کے محتاج نہیں ہیں ان کے بیشتر پروگرامس آپ حضرات سن چکے ہوں گے ۔ پھر یکے بعد دیگرے گلوکار آتے رہے

اور اپنی آواز کا جادو جگاتے رہے۔

دیر رات گئے جب پروگرام محفل غزل اختتام کو پہنچا تو عامر اور تمیز باہر نکل آئے۔ ایک ٹیکسی رکوائی اور ہاسٹل روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن صبح دس بجے تمیز کو اپنے وطن نظام آباد کے لئے نکلنا تھا اور اسے انتظار تھا عامر کا۔ جو یہ کہہ گیا تھا کہ اس کے آنے تک وہ اس کا انتظار کرے گی دس سے گیارہ بجنے کو آگئے تھے۔ لیکن عامر کا کہیں کچھ پتہ نہ تھا وہ عجیب و غریب الجھن میں گرفتار ہاسٹل کے لان میں چکر کاٹ رہی تھی کہ کہیں عامر کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ وہ بے تابی سے اس کی منتظر تھی اور بار بار اس کی نظریں مین گیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دفعتاً ایک ٹیکسی ہاسٹل کے گیٹ پر رکی جس سے عامر اتر رہا تھا تمیز تقریباً دوڑتی ہوئی گیٹ پر پہنچی اور کہنے لگی۔

"بہت دیر کر دی تم نے میں کب سے تمہارے انتظار میں یہاں چکر کاٹ رہی ہوں۔ آخر ہوا کیا تھا۔

" کچھ نہیں بازار کھلنے میں دیر ہو گئی تھی مجھے کچھ خریدنا تھا تمہارے لئے "۔ یہ کہتے ہوئے اس نے دو پیکٹ تمیز کی طرف بڑھا دیئے اور کہا۔ اس ناچیز کی طرف سے اپنی "جان" کے لئے معمولی سا تحفہ۔

" افوہ .... تم بھی ٹو مچ کر دیتے ہو کبھی کبھی تمہارے انتظار میں یہاں میری جان نکلی جا رہی تھی اور جناب ہیں کہ بازار کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ پتہ ہے کیسے کیسے بھیانک وسوسے گھیرے رہے تھے مجھے۔ تم آئے تمہیں دیکھا تو جان میں جان آگئی۔ اب ان تحفوں کی بھلا کیا ضرورت پڑی تھی۔ مجھے تم مل گئے ہو بھلا اس سے انمول تحفہ بھی اور کچھ ہو سکتا ہے تمیز نے اپنی نگاہوں کو جھکاتے ہوئے کہا اور جلدی سے جاتی ہوئی کہنے لگی چلیے چلتے ہیں میرا سامان بندھا پڑا ہے "۔

کچھ دیر کے بعد دونوں ٹیکسی لئے سکندرآباد اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ تمیز جب

اپنے وطن جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئی اور ٹرین چلنے لگی تو بہت دور تک عامر اپنی دستی ہلاتے ہوئے اسے الوداع کر رہا تھا۔ جب ٹرین پوری طرح اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بوجھل بوجھل قدم رکھتا ہوا اسٹیشن سے باہر جانے لگا۔ تصور میں تمیز کا مسکراتا چہرہ سجائے وہ گھر لوٹ گیا۔

ٹریننگ ختم ہونے کے کوئی دو مہینے بعد تمیز کو ملازمت کا پروانہ مل گیا اسے اسی کے وطن پر پوسٹنگ دی گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ خدا کے حضور شکرانہ بجا لانے کے لئے سجدہ ریز ہو گئی پھر اس نے ڈیوٹی جائن کر لی۔ بہت جلد دفتری کام میں اس نے مہارت حاصل کر لی اس کے آفیسرس اس کے کام کی بہت تعریف کرتے اس نے کبھی بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا وہ محنت اور ایمانداری میں یقین رکھتی تھی کیونکہ اس کی ماں نے اس کی پرورش اسی ڈھنگ سے کی تھی انہوں نے اسے خدا سے ڈرنے، ایمانداری لگن اور محنت سے کام کرنے کا درس دیا تھا اسی طرح شب و روز گزرتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ملازمت کا ایک سال مکمل ہو گیا تھا اس ایک سال کے عرصہ میں عامر کے اسے بے شمار خطوط ملے تھے اور اس نے بھی ہر خط کا جواب دیا تھا۔ عامر کی پوسٹنگ حیدرآباد سے دوسرے مقام پر ملی تھی۔ وہ بھی اپنا کام پوری ایمانداری کے ساتھ انجام دیتا۔ شب و روز مطمئن انداز میں گزر رہے تھے وہ بے حد خوش تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کا پھل اسے عطا کیا تھا اب اس کی عین خواہش تھی کہ نوید انجینئرنگ کی ڈگری اعلیٰ نمبر سے مکمل کر لے۔ وہ چاہتی تھی اور یہی دعا کرتی تھی کہ نوید ایک ممتاز انجینئر بنے۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹنے میں اتنی کھوئی تھی کہ دن ڈھل کر شام ہو چلی تھی اور قمر جہاں اسے آواز دے رہی تھیں۔ تمیز بیٹی شام ڈھل رہی ہے آج چائے نہیں پیو گی کیا۔

"ابھی آئی امی"۔ کہتی ہوئی وہ اٹھ بیٹھی اور کمرے سے باہر چلی آئی۔

- کیا سو رہی تھیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری" کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی

ہو۔ امی نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس یونہی لیٹی تھی۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ یہ کہتی ہوئی وہ پہلے باتھ روم گئی منہ ہاتھ دھویا تو وہ تازہ دم ہو گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے بہت فرحت بخش محسوس ہونے لگے اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ چائے کے ساتھ کچھ آلو پکوڑے بھی بنائے اور ٹرے میں سجا کر لے آئی اس کی امی برآمدے میں بچھے تخت پر نماز عصر کے بعد تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ جب تمیز کو چائے کی کشتی تھامے آتے ہوئے دیکھا تو وہ اٹھ بیٹھیں اور اس کے ہاتھوں سے کشتی لے کر تخت پر رکھ دیا۔

وہ دونوں گرم گرم پکوڑے کھانے لگیں۔ اس کی امی کسی خاص سوچ میں گم تھیں۔ کچھ دیر توقف کے بعد انہوں نے تمیز سے پوچھا۔

"نعمان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے"؟ دراصل بیٹی تمہیں پتہ نہیں تمہاری پھوپھی بہت تیز عورت ہیں اگر ہم نے انکار کر دیا تو نجانے وہ کیا کیا کہتی پھریں گی ہم پر کوئی بہتان تراش کر ہمیں بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑیں گی۔ بس میں بدنامی کے خوف سے ڈرتی ہوں۔ وہ بہت خراب خصلت کی عورت ہیں قمر جہاں نے دبے دبے لہجے میں اپنے اندیشے ظاہر کیے۔

نعمان بھائی مجھے قطعی پسند نہیں ہیں۔ میں نے آپ سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ مجھے اس گھر میں نہیں جانا ہے آپ قطعی انکار کر دیں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ آپ پھوپھو جان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہیں اور نعمان بھائی کے چال چلن سے آپ بے خبر نہیں۔ پھر آپ اس رشتہ کے بارے میں کیسے سوچ رہی ہیں مجھے تعجب ہے۔ تمیز نے دو ٹوک جواب دیا اور چائے پینے لگی۔ اب وہ انہیں یہ کیسے بتاتی کہ اس نے اپنے جیون ساتھی کو چن لیا ہے اور وہ کسی کی ہو گئی ہے اس کی ہر ہر دھڑکن پر اب کسی اور کا قبضہ ہے اس کی نیندیں اب اس کی نہیں رہیں، اس کے

خواب اب اس کے نہیں رہے۔اس کی نس نس میں کسی کی محبت رچ بس گئی تب اس نے اپنے دل کے سنگھاسن پر کسی کو بٹھالیا ہے وہ اب اس سے بھلا بے وفائی کیونکر کر سکتی ہے کسی کی زندگی کیسے ویران کر سکتی ہے۔ کسی کو کیسے تنہائی کے صحراء میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ سکتی ہے۔

عامر، عامر اس کے دل کی دھڑکن۔اب عامر کے نام منسوب تھی اور یہی نام اس کے خوابوں کے محل میں گونج رہا تھا۔دل کے نہاں خانوں میں سرگوشیاں کرتا پھرتا۔عامر جس کے پیار کے گہرے ساگر میں ڈوب گئی تھی وہ اب وہاں سے اوپر اٹھنا اور کسی اور کے بارے میں سوچنا اب اس کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا بھلا وہ اس جرم کی مرتکب کیوں کر ہو سکتی ہے۔

ٹھیک ہے بیٹی .... میں تمہاری پھوپھی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ قمر جہاں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور چائے کی کشتی سمیٹے باورچی خانہ کی جانب چل پڑیں لیکن وہ اب ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گئی تھیں...... رفیعہ خانم کو کس طرح ٹالا جائے وہ یہی سوچ رہی تھیں انہیں یہی خوف کھائے جارہا تھا کہ نجانے ان کے انکار کا کیا ردعمل رفعیہ خانم پر ہوگا۔وہ ایک چالاک اور مکار قسم کی عورت تھیں۔جنہیں انکار سننے کی عادت نہیں تھی وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی رہیں یا اللہ اس نئی مصیبت کو کسی نہ کسی طرح ٹال دے۔

ادھر رفعیہ خانم گھر لوٹ کر نعمان سے کہہ رہی تھیں۔میں نے قمر جہاں سے تمیز کو تمہارے لئے مانگا ہے دیکھو نعمان اب ہمارے پہلے جیسے حالات نہیں رہے خدا مغفرت کرے تمہارے ابو رہتے تو کوئی جنجال ہی نہ تھا وہ جب سے گئے ہیں ہمیں آرام و آسائش کو چھوڑنا پڑا۔تھوڑی بہت آمدنی جو کھیتوں سے ہوتی ہے وہ بھی اب باقی نہیں رہی تمہاری لاپرواہی کے نتیجے میں سارے کھیت زمینداروں نے ہتھیا لیے اور ہم ہاتھ ملتے رہ گئے اور تم نے نہ تو تعلیم ہی مکمل کی کہ کوئی ملازمت سے لگ جاتے اب

رہا سہا سہارا بس مکان کا کرایہ ہے جو کہ اس مہنگائی کے دور میں ناکافی ہے۔ میں نے سوچا لڑکی کماؤ پوت ہے بینک میں ملازم ہے کیوں نہ بات چلائی جائے۔ میں نے قمر جہاں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تمیز پر پہلا حق میرا ہے۔ نعمان تمہارا بھانجہ ہے اور تمیز خاندان سے باہر نہیں بیاہی جائے گی۔ اب دیکھتے ہیں کہ قمر جہاں کا جواب کیا ہوتا ہے رفعیہ خانم نے اپنے منصوبے سے نعمان کو واقف کرایا۔

نعمان اپنی ماں کی ساری گفتگو سنتا رہا پھر کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا۔ آپ یہ کیسے سمجھ رہی ہیں کہ ممانی جان یہ رشتہ منظور کرلیں گی۔ ماموں جان کے انتقال کر جانے کے بعد سے ابھی تک آپ نے کبھی ان کی خبر نہیں لی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ..... کبھی ہمدردی کے دو بول ہی سہی آپ نے نہیں بولے اور آج جب وہ لوگ مصیبتوں کے پہاڑ جھیل کر سکھ کی سانس لے رہے ہیں تو آپ وہاں پہنچ گئیں۔ کیا حق تھا آپ کو وہاں جا کر رشتہ مانگنے کا۔ نعمان نے ماں کو کھری کھری سنائی اسے اپنی ماں کا طور طریقہ قطعی پسند نہ تھا وہ انہیں بدل بھی تو نہ سکتا تھا۔ اس کے دل میں قمر جہاں، تمیز اور نوید کے لئے بے حد عزت تھی وہ انہیں بے حد پسند کرتا تھا وہ اس لئے کہ جس طرح انہوں نے اپنی زندگی کی آزمائش کی گھڑیوں کو صبر و تحمل اور محنت سے جھیلا تھا کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا اور اپنی روکھی سوکھی ہی میں گزارا کیا تھا اور بچوں کو آگے تعلیم دلوائی تھی۔ اچھی تربیت دی تھی یہی سب کچھ وہ بہت محسوس کرتا تھا ان کی قدر و منزلت اس کی نگاہ میں بڑھتی گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف ہو۔ ویسے بھی وہ خود کو کسی طرح بھی تمیز کے قابل نہ سمجھتا تھا۔ کہاں تمیز اور کہاں وہ..... وہ ایک قابل و ہونہار لڑکی تھی تعلیم یافتہ اور برسر روزگار اور وہ اس نے تو ایس ایس سی ہی گرتے پڑتے کامیاب کیا تھا اور اپنی ماں کی غلط تربیت کی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔ دن بھر بے روزگار دوستوں میں وقت کاٹنا اور رات دیر گئے گھر لوٹنا اس کے روز کا معمول تھا۔ لیکن تھا وہ صداقت پسند اس نے

صاف صاف لفظوں میں اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ ممانی جان اور تمیز کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا اسے یہ رشتہ قطعی پسند نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک کماؤ پوت بیوی کا بے روزگار شوہر کہلائے۔

یہ سب سننے کے بعد رفیعہ خانم بھڑک اٹھیں نعمان کیا بکے جارہے ہو۔ لگتا ہے تیری سٹی ہی گم ہو گئی ہے میں تو تیرے بھلے کے لئے یہ سب کچھ کر رہی ہوں اور پھر تو کوئی غیر تو نہیں بھانجہ ہے ان کا۔ سب سے پہلا حق تیرا ہی ہے بیٹا۔ یہ تو نے کیونکر سمجھ لیا کہ تو بے روزگار ہے۔ کیا کمی ہے اپنے پاس۔ دس بارہ ملکیوں کا تو واحد وارث ہے۔ ان کے کرائے میں ہی تو گزارا کر سکتا ہے تجھے کیا پڑی ہے کہ تو ملازمت کرتا پھرے۔ دیکھ نعمان میں کہہ رہی ہوں ایک بار اچھی طرح سوچ لے اگر تمیز سے تیری شادی ہو جائے تو تیری زندگی سنور جائے گی۔ وہ بہت ذہین سمجھ دار سگھڑ لڑکی ہے زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف تجھے ویسی ہی لڑکی چاہیے جو کہ تجھے بھی سنبھال لے اور اس گھر کو بھی۔ سمجھا کچھ۔ رفیعہ خانم نے نعمان کو بڑی محبت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے سوچ کر جواب دوں گا۔ نعمان نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور چلا گیا۔

آج اتوار تھا موسم گرما کی صبح بہت دلفریب تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے قریب میں کہیں بارش ہوئی ہو ہوائیں اپنے ساتھ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی لئے ہوئے تھیں تمیز اپنے بستر پر لیٹی گہری نیند سو رہی تھی رات اس نے بے حد حسین خواب دیکھا تھا اور شاید اس کا اثر تھا کہ اس کے نازک ہونٹوں پر سبک سی مسکراہٹ دوڑی ہوئی تھی رات خواب میں اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے سامنے سفید رنگ کی ایک کار آرکی ہے اور اس میں سے عامر اور اس کی والدہ اتر رہی ہیں۔ اس نے اتنا ہی دیکھا تھا کہ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ رات

کا تیسرہ پہر تھا صبح کے تین اور چار کا عمل تھا وہ اٹھی وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی سر بسجود ہو کر خالق کائنات کے آگے ہاتھ پھیلائے آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی سجائے دعا مانگ رہی تھی کہ اے مالک دو جہاں ابھی جو خواب میں نے دیکھا ہے اسے سچ کر دے مجھے میری پھوپھی جان سے بچالے۔ان کی تمام چالیں ناکام کر دے۔آمین۔ ثم آمین۔

اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ دعا ضرور قبول کرے گا۔ صبح سویرے ہی پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔موذن اذان دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا آؤ بھلائی کی طرف آؤ کامیابی کی طرف وہ اٹھی وضو کیا اور نماز فجر ادا کی پھر قرآن پاک لے کر سورہ یٰسین کی تلاوت کی اور پھر رات والی دعا دہرائی اور آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی چونکہ رات اس کی نیند پوری نہ ہو سکی تھی اور پھر آج صبح غیر معمولی سہانی تھی۔ ٹھنڈی فرحت بخش ہوائیں اسے نیند کی آغوش میں پہنچا رہی تھیں۔وہ جلد ہی سو گئی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے نیند کی گہری وادیوں میں بھٹک رہی تھی۔

صبح کے ساڑھے نو بجے ہوں گے کہ اس کے گھر کے سامنے ایک سفید کار آکر رکی اور ہارن بجنے لگے۔وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ رات والا خواب واقعی حقیقت کا روپ دھار لے گا۔

وہ جلدی جلدی بستر سمیٹ کر اپنا حلیہ درست کرنے لگی کنگھا لے کر اپنے الجھے ہوئے بال کو کسی حد تک سنوارا کپڑے درست کیے اور دوڑتی ہوئی دروازے تک چلی گئی جب دروازہ کھولا اس کے سامنے کار میں عامر اور اس کی والدہ کو بیٹھا ہوا پایا اپنی آنکھوں پر اسے یقین ہی نہ آیا لیکن وہ واقعی اس کے سامنے تھے۔عامر کار کا دروازہ کھول کر پہلے خود اترے اور آگے آکر بائیں جانب کا دروازہ کھول کر اپنی ماں کو اتارا پھر ڈرائیور سے کہا کہ ڈکی میں رکھا سوٹ کیس لے آئے۔ تمیز آگے بڑھی اور عامر کی امی کو بہت احترام سے سلام کیا تو انہوں نے اسے دعائیں دیں اور خود سے لپٹا لیا۔پھر تمیز کی رہبری میں وہ دونوں مہمان خانہ میں آبیٹھے تمیز بوکھلائی بوکھلائی سی

دوڑتی ہوئی آئی اور اپنی ماں قمر جہاں سے عامر اور اس کی والدہ کے آنے کی خبر دی تو وہ بھی ان سے ملنے دیوان خانہ کی طرف دوڑی چلی گئیں۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئیں ایک نظر ہی میں انہوں نے عامر کی والدہ کو پہچان لیا اور بھابھی آپ..... کہتی ہوئی ان سے لپٹ گئیں ان دونوں ہی کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ برسوں بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ عامر اور تمیز دونوں دم بخود حیران حیران سے یہ جذباتی منظر دیکھ رہے تھے تمیز کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں جب کچھ غبار چھٹا تو ان دونوں ہی نے اپنے اپنے بچوں کی حیرانی کو دیکھ کر ان کی حیرانی کو دور کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں کے والد محترم ایک دوسرے کے بے حد گہرے دوست تھے ایک عرصہ ہوا ملک کے حالات بدلنے پر بچھڑ گئے تھے اور آج قدرت نے انہیں جب ملایا بھی تو ایسے وقت میں جب کہ دو عزیز دوست اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

دن بھر قمر جہاں اور رئیسہ بیگم نے ماضی کی داستانیں دہرائیں پھر رئیسہ خانم نے قمر جہاں کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو قمر جہاں ایک بار پھر ان کے گلے لگ گئیں اور کہا مجھے اس سے بہتر رشتہ تمیز کے لئے اور کیا مل سکتا ہے آپ نے آکر مجھے ایک کڑی آزمائش سے نکال دیا ہے اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو یہاں بھیج دیا ورنہ میں اندیشوں اور فکروں کے بھنور میں پھنسی جا رہی تھی پھر انہوں نے مختصر الفاظ میں اپنی نند رفیعہ خانم کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "رئیسہ بیگم مجھے خوشی ہے کہ دو بچھڑے دوستوں کے خاندان پھر یکجا ہوئے ہیں۔ عامر جیسے لائق فائق بیٹے کو پا کر میں بے حد خوش ہوں۔ انہوں نے بے حد جذباتی انداز میں کہا تو رئیسہ بیگم بھی خوشی سے رو پڑیں اور قمر جہاں کے گلے لگ کر بہت دیر تک روتی رہیں اور کہتی رہیں کہ کاش آج دو دوست زندہ ہوتے دونوں کا درد مشترک تھا۔ غم ایک تھا لیکن آج دونوں ہی اس خوشی کو پا کر اپنے اپنے مرحوم شوہروں کو یاد کر رہی تھیں۔

قمر جہاں نے رات میں ایک مختصر سی دعوت کا اہتمام کیا جس میں پڑوس کی دو

ایک خواتین کو بھی مدعو کر لیا۔ تمیز کی دو ایک دوست جو پڑوس میں رہا کرتی تھیں وہ بھی آگئیں اور تمیز کو دلہن بنانے میں جٹ گئیں دعوت کے اختتام پر تمیز اور عامر کی علحدہ علحدہ گلپوشی کی گئی رئیسہ بیگم نے تمیز کی انگلی میں نیلے رنگ کا پتھر جڑے طلائی انگوٹھی پہنائی اور اسے عامر سے منسوب کر دیا۔ قمر جہاں نے بھی عامر کو ایک عدد سوٹ بنوایا اور گلپوشی کی۔ رات دیر گئے یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

دوسری صبح عامر اور رئیسہ بیگم واپس ہو گئے شادی ایک ماہ بعد مقرر کی گئی تھی۔ ادھر وہ لوگ گئے اور ادھر رفیعہ خانم جواب مانگنے آپہنچیں۔ تمیز نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا تو انجانے ہی میں ان کی نظر انگلی میں جگمگاتی انگوٹھی پر پڑی۔ وہ غیر یقینی انداز میں قمر جہاں کی جانب جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ تب قمر جہاں نے انہیں بتایا کہ کل رات ہی تمیز کی منگنی ہو گئی ہے اور یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ وہ کسی کو مدعو بھی نہ کر سکیں۔

اتنا سنتے ہی رفیعہ خانم اپنی چادر سمیٹے واپس پلٹ گئیں تو قمر جہاں نے اطمینان کا سانس لیا اور تمیز اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹے لیٹے مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگی۔ وہ خواب جن پر صرف اور صرف عامر کا قبضہ تھا پھر اس نے عامر کی طرف سے پہنائی ہوئی انگوٹھی پر اپنے نازک لب رکھ دیئے اور خود ہی شرما گئی نجانے کیوں دو موتی اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے رخسار کا سہارا لیتے ہوئے اس کے آنچل میں جذب ہو گئے یہ وہ آنسو تھے جو منزل کو پالینے کی خوشی میں بہہ نکلے تھے۔

منزل کے نشاں

اس نے جب پہلی بار اسے اپنے دوست عارف کے گھر پر ڈنر پارٹی میں دیکھا تو کچھ لمحوں کے لئے اپنے اطراف کے ماحول سے بے خبر اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا پھر جیسے ہی ان کی نگاہیں ٹکرائیں اسے اپنی غلطی پر ندامت کا احساس ہوا پھر وہ بے اختیار اپنی نظریں جھکانے پر مجبور ہو گیا اس کا معصوم حسن اسے دعوت نظارہ دے رہا تھا خوب صورت کٹورا سی آنکھیں صاف شفاف رنگت اور دراز بل کھاتی ہوئی زلفیں اور پھر شرم و حیا کی جو چادر اس نے اوڑھ رکھی تھی اسے مشرقی حسن کا شاہکار بنادیا تھا امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور مغربی تہذیب زدہ ملک میں ایسی شرم و حیا میں ڈوبی لڑکی بھی مل سکتی ہے۔ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا وہ ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ اس کے دوست عارف نے اسے مخاطب کیا۔ ان سے ملو عمران یہ ہیں میری کزن ڈاکٹر رعنا۔ یہ بھی اپنے ہی وطن یعنی حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہیں یہاں آئے کوئی دو سال کا عرصہ ہو رہا ہے یہ اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ یہاں رہتی ہیں! اور رعنا یہ ہیں میرے دوست عمران جو حال ہی میں امریکہ تشریف لائے ہیں۔ سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی ہے اور یہاں آگے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔! عارف نے جیسے ہی اپنی بات ختم کی ان دونوں نے رسمی طور پر سلام اور مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اور خاموش ہو رہے۔ پھر جب پارٹی ختم ہوئی تو عمران نے عارف سے اجازت چاہی اور جانے سے قبل اس نے عارف سے کہا مجھے تم سے کچھ اہم بات کرنی ہے اگر دو ایک روز کے بعد ملاقات کر سکو تو میں تمہارا مشکور رہوں گا۔ پھر وہ ملاقات کے لئے مقام اور وقت طے کر کے وہاں سے لوٹ آیا۔

عمران جب سے عارف کے گھر سے لوٹا تھا نہ جانے کیوں بار بار اس معصوم

لڑکی کا پیکر اس کے خیالوں اور خوابوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھا ایک لمحے کے لئے بھی وہ اس کے تصور سے ہٹ نہیں پائی تھی۔اس کی وہ جھکی جھکی نگاہیں اور دبیز و پروقار مسکراہٹ جیسے اس کے تصور سے چپک سی گئی تھی اسے دیکھنے کے بعد نجانے کیوں اک احساس سا اس کے دل و ذہن پر چھا گیا تھا کہ وہ ضرور کسی کی ستائی ہوئی ہے اسے دیکھنے کے بعد اس نے یوں محسوس کیا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے نازک احساسات کے آبگینوں کو پاش پاش کر دیا ہو اور اس کی کرچیاں اس کے دل کو زخمی کر گئی ہوں ورنہ اتنی کم عمری میں اس طرح کی سنجیدگی کوئی معنی نہیں رکھتی نجانے یہ احساس بار بار عمران کو کیوں پریشان کر رہا تھا۔وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔اک اضطرابی کیفیت اس پر طاری تھی۔وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی عنوان نہ دے پا رہا تھا۔

عمران سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی کے مشورے پر امریکہ چلا آیا تھا تاکہ مزید تعلیم حاصل کر سکے۔اور ساتھ ہی کوئی معقول سی سروس بھی۔اس کے بھائی اور بھاوج کو امریکہ میں رہتے ہوئے آٹھ دس برس کا عرصہ ہو رہا تھا اسے یہاں آئے ہوئے دو سال ہو رہے تھے اس کی اپنی جد و جہد اور ساتھ ہی اس کے بھائی کے اثر و رسوخ کے باعث اسے ایک تعمیراتی کمپنی میں سائٹ انجنیئر کی حیثیت سے سروس بھی مل گئی تھی اور وہ پارٹ ٹائم کورس بھی کر رہا تھا اس کے والدین اور دوسرے بھائی بہن انڈیا میں شہر حیدر آباد میں مقیم تھے اس کے ایک اور بڑے بھائی اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم تھے۔انہیں بھی وطن چھوڑے ہوئے تقریباً بیس برس ہو رہے تھے۔بہر کیف ان کی فیملی کے نصف افراد خاندان انڈیا سے باہر دوسرے ممالک میں بسے ہوئے تھے۔

عمران نے جب پہلی بار امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو ایک عجیب سا احساس اس پر طاری تھا۔عجیب و غریب قسم کی داستان اس ملک اور یہاں کے بارے میں اس نے سن رکھی تھی۔یہاں کی آزاد فضا اور اس میں پنپنے والے واقعات اس نے اپنے

دوستوں سے سن رکھے تھے۔اسی لئے کچھ گھبرایا گھبرایا سا تھا بچپن سے ہی وہ خاموش طبع اور سنجیدہ قسم کی طبعیت کا مالک تھا اور ساتھ ہی خدا کا خوف ہر لمحہ اس پر طاری رہتا اس نے اپنے ضمیر کی بتائی ہوئی راہوں کا ہر وقت انتخاب کیا تھا اور اپنی منزل تک جا پہنچا تھا۔

ہوٹل انٹرکانٹی ننٹل میں ایک ٹیبل آج شام عمران کے نام بک تھا۔ عمران نے ایک ایسی کونے والی میز بک کروائی تھی جہاں کا ماحول دوسری میزوں سے کسی قدر پر سکون تھا۔جہاں بیٹھ کر آرام سے گفتگو کی جا سکتی تھی۔طے شدہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ دونوں وہاں پہنچ گئے تھے۔جب وہ دونوں اپنی مخصوص ٹیبل پر جا بیٹھے تو بیرا ان کی مطلوبہ ڈشیں سجانے لگا۔پھر وہ دونوں کسی خاص موضوع پر گفتگو میں منہمک ہو گئے۔عارف تفصیلی طور پر عمران سے کچھ کہہ رہا تھا اور عمران بغور اس کی بات سنتا جا رہا تھا کبھی کبھی درمیان میں وہ کوئی سوال کر بیٹھتا اور عارف جواب میں اپنی بات جاری رکھتا۔عمران کے چہرے پر کبھی تاسف کے اثرات ظاہر ہوتے اور کبھی وہ ہمدردی کا اظہار کرتا۔عارف جب اپنی بات ختم کر چکا تو عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس ساری گفتگو کا حاصل اسے مل گیا ہے اور وہ کوئی اہم فیصلے پر پہنچ چکا ہے پھر وہ دونوں جب ہوٹل سے باہر نکلے تو عمران کے چہرے پر ایک عزم سا چھایا ہوا تھا۔اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم فیصلہ کر چکا ہے اور اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے جا رہا تھا۔

وہ وہاں سے سیدھا گھر پہنچا گھر پر اس کے بھائی اور بھابھی کو اس نے اپنا منتظر پایا۔انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا پھر کپڑے بدل کر جب باہر آیا تو دیکھا کہ بھیا اور بھابھی کھانے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں تو سیدھا وہیں چلا آیا کھانے کے دوران جب وہ خاموش تھا تو بھابھی نے اسے چھیڑا۔کیوں بھئی عمران کسی خاص سوچ میں گم ہو۔کوئی خاص مسئلہ ہو تو ہمیں

بھی بتاؤ۔ ممکن ہے ہم حل کر دیں۔! انہوں نے سوالیہ نگاہیں اس پر جما دیں ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

ہاں بھابھی ایک خاص مسئلہ ہی سمجھیے۔ وہ کچھ دیر رکا پھر اس نے راست اپنی بھابھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھابھی فرض کیجئے کہ آپ کا ایک چھوٹا بھائی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرے۔ جو سوسائٹی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ خوبصورت بھی ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی لیکن جس طرح خدا تعالیٰ نے ہر بشر کو کسی نہ کسی عیب سے نوازا ہے اس بے چاری میں بھی یہ عیب ہے کہ اس کی شادی ایک نامعقول قسم کے شخص سے ہوئی تھی اور کسی وجہ سے یہ شادی ناکام ہو گئی اور صرف ایک ہفتہ کے اندر اندر ان دونوں میں طلاق ہو گئی تو آپ کا کیا رد عمل ہو گا۔ کیا آپ اس شادی کی اسے اجازت دیدیں گی۔! وہ انہیں بغور دیکھنے لگا۔

بھابھی یک بیک چونک اٹھیں۔ انہوں نے تعجب خیز نگاہوں سے عمران کو دیکھا اور کسی خاص سوچ میں گم ہو گئیں کچھ لمحے خاموش گزر گئے۔ اس کے بھائی خاموش تماشائی بنے ان دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ پھر اس کی بھابھی نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ لڑکی کون ہے! کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کا کردار اور چال چلن کیسا ہے۔ ہمیں ان باتوں کا جائزہ لینا چاہیئے اور اگر یہ ساری باتیں لڑکی کے حق میں ہوں تو دوسری وجہ یہ معلوم کرنی چاہیئے کہ پہلی شادی کے ٹوٹنے کا سبب کیا تھا۔ کیا یہ صرف لڑکے کی جانب سے اٹھایا ہوا اقدام تھا یا اس میں لڑکی کا بھی کوئی قصور ہے وہ کچھ دیر چپ رہیں پھر انہوں نے عمران کو مخاطب کر کے کہا۔ لیکن عمران۔ یہ سب کچھ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔!"

" دراصل بھابھی میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ ایک عورت اپنی ہم جنس کے لئے کس قسم کے جذبات اپنے اندر رکھتی ہے۔ عمران نے بھابھی کو تنگ کرنے کی غرض

سے اپنی بات گول کر دی اور مسکراتا ہوا واش بیسن کی طرف بڑھ گیا پھر بھیا اور بھابھی وہاں سے اٹھ کر ہال کے اس حصے میں آبیٹھے جو بطور ڈرائینگ روم استعمال ہوتا تھایہاں خوب صورت قالین پر صوفہ سیٹ سجا ہوا تھا اور دیوار پر ایک دل آواز سینیری آویزاں تھی ۔ ساتھ ہی ایک کونے میں شیشے سے بنا اسٹول اور اس پر رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ خوب صورت گلدستہ سجایا گیا تھا جب عمران بھی آگیا تو بھابھی نے گرم گرم چائے ان کے سامنے رکھ دی ۔ وہ تینوں آہستہ آہستہ چائے سپ کرنے لگے اسی درمیان اس کے بھائی نے جو ایک کھلے ذہن کے مالک تھے اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر کہا ۔" میرا خیال ہے شاہینہ ہمیں اس لڑکی سے شادی کی اجازت دے دینی چاہیئے ۔" بھلا وہ کیوں ۔؟" شاہینہ نے سوالیہ نگاہیں اپنے شوہر پر مرکوز کر دیں ۔

" اس لئے کہ ایک ایسی لڑکی جس کے آگے زندگی کا ایک طویل سفر پڑا ہے ۔ جو ایک تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی ہے اور اپنے طور پر کچھ کر گزرنے کے قابل ہے ! بھلا ایسی لڑکی کو زندگی کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرانے کے لئے تنہا چھوڑ دینا اس کے ساتھ سراسر ظلم ہوگا ۔ زیادتی ہوگی انسانیت سے گری ہوئی اور غیر اخلاقی حرکت ہوگی ۔ اس ایک کم ظرف انسان کی وجہ سے اس لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا کہاں کا انصاف ہے کم از کم میں تو یہ برداشت نہیں کر سکتا ۔"

" واہ بھیا واہ کمال کر دیا آپ نے ۔ اچھی بھلی تقریر دے ماری آپ نے عمران نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا مجھے آپ سے یہی امید تھی ۔ پھر اس نے شاہینہ کو مخاطب کر کے کہا ۔ دیکھا بھابھی آپ نے ۔ آپ عورتیں نجانے کیا کچھ سوچنے لگ جاتی ہیں ۔ ہم مرد واقعی صاف ذہن ہوتے ہیں آپ عورتوں کے مقابلے میں ۔" عمران نے شاہینہ پر چوٹ کی اس پر شاہینہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی پھر اس نے کہا عمران اب بہت مذاق ہو چکا ہے تم پہلیاں مت بجھاؤ اور صاف صاف بتاؤ کہ وہ لڑکی ہے کون جس پر ہمارے دیور جی کا دل آگیا ہے !

اب عمران کے چونکنے کی باری تھی۔ وہ ہکا بکا سا ان کا منہ تکنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ بھابھی یہ آپ نے کیوں کر جانا کہ میں اس سے شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اس پر بھابھی نے کہا۔" میں چند دنوں سے یہ محسوس کر رہی تھی کہ تم کسی خاص الجھن میں گرفتار ہو جمہارا کھویا کھویا رہنا اور ہر وقت کسی سوچ میں گم۔ ایسے تو کبھی نہ تھے تم اب ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب یہ بتادو کہ آخر وہ ہے کون جس نے ہمارے دیورجی کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔" بھابھی بھی اسے چھیڑنے پر تل گئی تھیں

عمران بہت ہی نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔ بھابھی یہاں قریب میں ایک حیدرآبادی فیملی رہتی ہے۔ دو بھائی ہیں اور ان کی بیگمات ان کے ساتھ ان کی ایک چھوٹی بہن بھی رہتی ہے۔ ڈاکٹر رعنا۔ سنا ہے اس کی شادی ہوئی تھی لیکن یہ شادی لڑکے کی مرضی کے خلاف والدین نے اپنی پسند سے کی تھی اس لئے لڑکے کو ناگوار گزرا لڑکی اسے پسند نہ آئی لڑکا کسی اور لڑکی کو پسند کرتا تھا چنانچہ شادی کے فوراً بعد وہ دونوں امریکہ پہنچے۔ اور پھر ایک ہفتہ کے اندر اندر موصوف نے اسے طلاق دیدیا تب سے وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہ رہی ہے یہ کوئی دو سال قبل کی بات ہے لڑکی درمیانہ قد اور خوبصورت ناک نقشہ کی مالک ہے ڈاکٹر ہے۔ انتہائی باوقار اور سنجیدہ طبعیت کی مالک ہے۔ بس آپ یوں سمجھئے کہ مشرقی حسن کا شاہکار ہے۔ مجھے بے حد پسند ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس سے شادی کروں اگر آپ لوگ اجازت دیں تو۔!!

لیکن عمران پہلے امی ابو سے اجازت لینی ہوگی اور پھر تمہیں ایک سے ایک خوبصورت اعلیٰ خاندان تعلیم یافتہ اور کنواری لڑکی مل سکتی ہے۔ تم ڈاکٹر رعنا ہی سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو۔ بھابھی نے دریافت کیا۔

اس لئے کہ یہ ایک نیک کام ہے اور یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ سوسائٹی میں اس معصوم او. بے گناہ لڑکی کو اعلیٰ مقام دلواؤں اور یہ ثابت

کر دوں کہ وہ پاکباز تھی۔اس کے لئے ظاہر ہے مجھے اپنے احساسات کی قربانی تو دینی ہی ہوگی۔جس کے لئے میں تیار ہوں۔!" عمران نے جذباتی لہجے میں کہا۔اس کے لہجے میں ایک عزم تھا اور ایثار جھلک رہا تھا۔

"اچھا عمران ٹھیک ہے کوئی اور قدم اٹھانے سے پہلے تم ایک بار مجھے اس لڑکی سے ملادو۔ پھر انڈیا خط لکھ کر میں امی ابا سے بھی اجازت لے لونگی۔" اس کی بھابھی نے کہا پھر وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کچھ عرصہ اسی طرح بیت گیا اس درمیان اس نے عارف کی وساطت سے بھابھی سے رعنا کی ملاقات کا انتظام بھی کروادیا۔ بھابھی ان کے گھر گئیں اور نہ صرف رعنا کو دیکھا بلکہ ان کی دونوں بھاوجوں سے بھی ملیں اور مزید تفصیلات سے بھی آگاہی حاصل کی۔ وہ جب وہاں سے لوٹیں تو بہت مطمئن تھیں پھر انہوں نے انڈیا اپنی سسرال خط لکھا اور امی ابا سے اس شادی کے لئے اجازت دینے کی درخواست کی۔انہوں نے خط میں کیا لکھا کسی کو معلوم نہ تھا۔لیکن جو جواب آیا تو سب سے زیادہ حیرت عمران کو ہوئی۔ کیوں کہ وہ اپنے والدین کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھا۔وہ لوگ پرانے خیالات کے مالک تھے اور اسے قطعی یہ امید نہ تھی کہ وہ لوگ اس شادی کے لئے اجازت دے دیں گے لیکن جب اس نے خط پڑھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ کیوں کہ نہ صرف انہوں نے شادی کی اجازت دی تھی بلکہ شادی کے فوراً بعد دولہا دلہن کو انڈیا بھیجنے کی بھی تاکید کی تھی۔ خط پڑھ کر عمران خوشی سے جھوم اٹھا اور فرط جذبات میں اس نے بھابھی کا ہاتھ چوم لیا اور کہا۔

"بھابھی ان ہی ہاتھوں سے لکھی گئی تحریر کا جادو ایسا جگا کہ کٹر پرانے خیالات کے حامل امی ابا اس شادی کی اجازت دے بیٹھے۔آخر آپ نے خط میں کیا جادو جگادیا بھابھی جس کے امی ابا شکار ہو گئے۔" اس نے خوشی سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

"یہ ایک بہت راز کی بات ہے جو تمہیں بعد میں بتاؤنگی تب جب کہ اس کا

وقت آئے گا۔ بھابھی نے بھی اسے ستانے کی ٹھان لی تھی۔

"ٹھیک ہے نہ بتائیں۔ ویسے مجھے اب کسی بھی وجہ کے جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ عمران نے لاپروائی کا اظہار کیا اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

پھر ایک مبارک دن ان کا نکاح ہو گیا۔ دوستوں کی کثیر تعداد اس نکاح میں شریک رہی اور سب نے عمران سے بغلگیر ہو کر اسے مبارکباد دی۔ پھر ڈنر سجایا گیا تھا۔ حیدرآبادی انداز کے پکوان سے سبھوں نے لطف اٹھایا کسی نے سچ کہا ہے کہ حیدرآبادی دنیا کے کسی بھی ملک میں کیوں نہ بس جائیں اپنا انداز اور طرز پکوان نہیں بھول سکتا۔ مرغ مسلم دو گوشہ بریانی اور میٹھے کی لذیذ ڈشیں ٹیبل پر سجائی گئی تھیں۔ اور سارے مدعوئین مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور داد دیئے جا رہے تھے۔ یہ محفل کافی دیر تک جمی رہی۔ پھر جب رات بڑھنے لگی تو رعنا کو عروسی لباس میں عمران کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔

عمران جب حجلہ عروسی میں اپنی دلہن رعنا کے قریب پہنچا اور آہستہ سے اس کا نقاب الٹا تو ایک لمحہ کے لئے مدہوش سا ہو گیا۔ اس کے حسن کی پاکیزگی سارے کمرے کو معطر کئے دے رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اس سے کچھ کہتا۔ رعنا نے دھیمے لہجے میں اس سے کچھ درخواست کی پھر کچھ لمحہ سرگوشیوں میں گزر گئے۔ پھر جب رعنا نے اپنی بات ختم کی تو عمران خوشی سے نہال ہو اٹھا اور محبت سے سرشار اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔

صبح جب وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو بھابھی اس کی منتظر تھیں۔ اس نے پہلے ادب سے انہیں سلام کیا اور معنی خیز نگاہوں سے انہیں دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ بھابھی مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے آپ نے خط میں امی ابا کو کیا لکھا تھا مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اس پر بھابھی نے اسے اپنے بہت قریب بلایا اور بڑے پیار سے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ "عمران مجھے تم پر ناز ہے۔ سچ ہے جب آدمی کی لگن سچی ہو

اور ایثار بے لوث ہو تو اللہ ضرور اسے انعام سے نوازتا ہے ۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ رعنا، بی بی مریم کی طرح پاک ہے اور ان چھوئی ہے اور جب اس نے اس بات کی تصدیق کی تھی تو مجھے بھی اس معصوم پر بے اختیار پیار آگیا تھا ۔ عمران مجھے تم پر فخر ہے کہ تم میرے دیور ہو ۔ خدا تمہیں ہر منزل پر پہنچنا آسان کرے اور کامیابی ہر گام پر تمہارے قدم چومے ۔ ان کا لہجہ جذباتی ہو گیا تھا ۔ نجانے کیوں ان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر دبیز قالین میں جذب ہو گئے ۔ یہ وہ آنسو تھے جو کسی کے تقدس اور کسی کے ایثار پر خود بخود بہہ نکلے تھے جس پر شاید فرشتے بھی مسرور ہو اٹھے ہونگے ۔!

پرائی خوشبو

سردیوں کی سہانی شام تھی ۔ آسمان پر جابجا شفق کی لالی پھوٹی پڑی تھی ۔ پرندوں کے جھنڈ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف رواں دواں تھے لیکن اتنے پر لطف منظر کے باوجود رما، جو اپنے کوٹھی جیسے گھر کی بالکنی میں کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اداس اداس سی تھی ۔ اس کی نگاہیں خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں ۔ اس کے چہرے پر اداسی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی اس کے خلا میں دیکھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ زندگی سے جنگ لڑتے لڑتے تھک گئی ہو اور اپنے آپ سے بھی بیزار ہو ۔

آج صبح ہی انیل اپنے دونوں بچوں کو چھوڑنے اوٹی گئے تھے ۔ سرما کی چھٹیوں کے بعد رجنی اور سنیل آج واپس چلے گئے تھے ۔ کچھ دن کے لئے اس گھر میں بہار کا سا سماں ہو گیا تھا، مگر اب پھر وہی تنہائی رما پر مسلط ہو گئی تھی ۔ رما سوچ رہی تھی کہ اتنا بڑا مکان ہے تمام سہولتیں ہیں ۔ کام کرنے کے لئے ملازم، گھومنے پھرنے کے لئے کاریں ۔ ہر آرام یہاں میسر ہے ۔ لیکن ذہنی سکون کہیں نہیں بھگوان کی بھی کیا لیلا ہے ۔ جہاں یہ سب آسائشیں موجود ہیں، سکون نہیں اور جہاں سکون قلب میسر ہے وہاں ضرورت کی دوسری چیزیں نہیں ۔

رما ان ہی خیالوں میں گم تھی کہ کال بیل کی مدھر آواز گونج اٹھی ۔ رما نے ملازم کو آواز دی: "رامو، ذرا دیکھنا کون آیا ہے ۔" پھر کچھ لمحے رکنے کے بعد وہ بھی داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی ۔ جیسے ہی اس کی نظر اپنے کالج کے زمانے کی ایک عزیز سہیلی شیلا پر پڑی تو جیسے اسے پر لگ گئے ہوں ۔ خوشی کے احساس سے سرشار وہ دوڑتی ہوئی اس سے جا لپٹی ۔

"ہیلو شیلا!" کہو کیسی ہو؟ کہاں رہتی ہو ۔ اور کب آئی ہو؟" ایک ہی سانس

میں اس نے کئی سوال کر ڈالے۔

شیلا بھی، جو اپنی بہتریں دوست رما سے ایک عرصہ بعد مل رہی تھی، بے انتہا خوش دکھائی دے رہی تھی۔ پرجوش انداز میں وہ رما سے لپٹ گئی۔ دونوں ہی کی آنکھیں اشک بار ہو رہی تھیں، کیوں کہ تقریباً پندرہ برس بعد دونوں کی آج ملاقات ہو رہی تھی۔ دونوں جب اپنے اپنے جذبات پر قابو پا چکیں تو اپنی آنکھیں خشک کرنے لگیں۔ پھر کچھ دیر بعد رما نے کہا۔ "پہلے مونہہ ہاتھ دھو لو۔ پھر شام کی چائے پی جائے گی اور پھر تفصیلی باتیں بھی ہوں گی۔"

پھر اس نے رامو سے کہا "رامو میم صاحب کا سامان اوپر والے کمرے میں لگا دو۔ اور باہر لان پر کرسیاں ڈال کر چائے وہیں لے آنا اور سنو۔ خانساماں سے کہو کہ کچھ گرما گرم سینڈوچ بھی تیار کر دے۔"

شیلا جب باتھ روم میں چلی گئی تو رما نے بھی مونہہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کر شیلا کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد شیلا کپڑے تبدیل کئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ وہ ایک دم تروتازہ لگ رہی تھی، جیسے صبح کا کھلا ہوا پھول۔ پھر جیسے ہی وہ نیچے آئی وہ دونوں لان کی طرف بڑھنے لگیں۔

باہر لان بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ گلاب کے پودے، چنبیلی اور موگرے کی بیلیں جا بجا لگائی گئی تھیں اور سبزہ زار دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کروٹن کے طرح طرح کے خوب صورت پودے رنگین گملوں میں سجے تھے۔ کچھ جھاڑیوں کو کاٹ کر کمانوں کی شکل دی گئی تھی۔ شیلا لان کی سجاوٹ اور خوب صورت کوٹھی کو دیکھ کر دم بخود تھی اور دل ہی دل میں رما کی زندگی پر رشک کر رہی تھی۔ لان کے ایک گوشے میں جہاں رنگ رنگ کے گلاب مہک رہے تھے، رامو نے کرسیاں لگا دی تھیں اور قریب رکھی تپائی پر ناشتہ اور چائے کا سامان سجا تھا۔

جب وہ دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر جم گئیں، تو رما نے گرم گرم سینڈوچ

شیلا کی طرف بڑھائے اور کہا " سناؤ شیلا اتنے دن کہاں رہیں ؟ شادی ہوئی یا نہیں ؟ بچے کتنے ہیں ؟ اور ہمارے دولہا بھائی کیا کرتے ہیں ؟ "

سینڈوچ کی پلیٹ سے ایک سینڈوچ لیتے ہوئے شیلا نے کہا " جب ہم نے کالج چھوڑا تھا تو اس کے فوراً بعد ہی پتاجی کا ٹرانسفر بنگلور کر دیا گیا اور ہم سب لوگ بنگلور شفٹ ہو گئے ۔ ان چند برسوں میں زندگی نے بے حساب اتار چڑھاؤ دیکھے ۔ ایم ۔ اے کرنے کے بعد پتاجی نے میری شادی طے کر دی تھی لڑکا بھی پوسٹ گریجوٹ تھا اور کسی فرم میں آفیسر تھا ۔ لیکن کسی طرح یہ رشتہ نہ ہو سکا ۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ جناب اپنے وقت کے فرہاد تھے ، کسی حسینہ کے عشق میں گرفتار تھے اور اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہنا پسند کرتے تھے ۔ والدین کی پسند پر شاید انہیں اعتماد نہ تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کی شادی ان کی اپنی پسند سے ہو ۔ چنانچہ پہلی منگنی ٹوٹ گئی ، جس کا مجھے تو کوئی افسوس نہ تھا ، لیکن ماں جی اور پتاجی کافی مایوس ہوئے ۔ "

" پھر کیا ہوا ؟ " رما جو بہت دل چسپی سے اپنی دوست کی کہانی سن رہی تھی ، بے ساختہ پوچھ بیٹھی ۔

پھر جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں ! " شیلا نے ترنم سے کہا اور دونوں کے قہقہے ابل پڑے ۔ پھر شیلا نے ایک سینڈوچ لیتے ہوئے کہا " پھر کیا ہونا تھا ؟ میں نے ماں سے کہا کہ آپ لوگ میری شادی کے لئے فکر مند نہ ہوں ۔ میں اتنی جلد اس بندھن میں بندھنا نہیں چاہتی ۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں سروس کر لوں گی ؟ انہوں نے اجازت دے دی تو میں مقامی گرلس کالج میں لکچرر ہو گئی ۔ "

" یہ تو بہت اچھا ہوا ۔ " رما اپنی دوست کی کامیابی پر بہت خوش دکھائی دے رہی تھی ۔ اس نے چائے بنائی اور ایک کپ چائے شیلا کی طرف بڑھا دیا ۔

رما کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے شیلا نے اپنی بات جاری رکھی ۔ پھر

میرا ٹرانسفر لڑکوں کے ڈگری کالج میں ہو گیا۔ وہیں میری زندگی نے کروٹ لی۔ کچھ لطیف لمحے میری زندگی سے آٹکرائے اور میں ان لمحوں میں کھو گئی۔ اتنی کھوئی کہ پھر لوٹ کر نہ آسکی۔ ڈگری کالج میں میری ملاقات سنجے سے ہوئی جو اکنامکس اور پولیٹکل سائنس پڑھاتے تھے۔ دیکھنے میں خوب رو اور بے انتہا شریف۔ میں خود بخود ان کی جانب کھنچتی گئی۔ اور ہم نے یک جا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سنجے کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، ہر ایک کے پیار سے محروم وہ زندگی کے صحرا میں تنہا بھٹک رہے تھے۔ میں نے انہیں سہارا دیا اور اتنا پیار دیا کہ وہ نہال ہو گئے۔ پھر ہم نے اپنے والدین کی مرضی سے شادی کر لی۔ ہماری شادی ہوئے پورے بارہ سال ہو رہے ہیں اور بھگوان کی دیا سے دو پھول ہمارے صحن زندگی میں کھل چکے ہیں۔ ہیما بڑی ہے اور راجو چھوٹا۔ یہ بارہ سال بہار کے ایک جھونکے کی مانند گزر گئے ہیں اور ہم نے اس درمیان زندگی کے ایک ایک لمحے کا لطف اٹھایا ہے۔ میں اور سنجے بس یوں سمجھو کہ ایک دوسرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے اب تم ہی دیکھو نا ان کا ٹرانسفر یہاں ہوا تو وہ مجھے بھی یہاں ساتھ لے آئے۔ ہیما اور راجو کو ماں کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ تم بھی یہیں ہو تو سوچا تمہارے پاس ہی قیام کیا جائے اسی لئے چلی آئی۔ تمہارا ایڈریس معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ اپنی کلاس فیلو جانکی ہے نا، جو میری کزن بھی ہے۔ اسی سے میں نے تمہارا ایڈریس لیا ہے۔ سنجے شام تک اپنے کالج سے لوٹیں گے ان سے بھی میں نے یہیں آنے کے لئے کہا ہے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا شیلا کہ یہاں چلی آئیں۔ ویسے بھی میں تنہائی میں بور ہو رہی تھی اور تم جیسی ساتھی کی منتظر بھی تھی۔ اب تم ہی دیکھو اتنی بڑی کوٹھی اور رہنے والے صرف دو آدمی۔ رہے بے چارے ملازم تو وہ کام ختم کر کے شام کو اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ہیں۔ بس رامو یہاں رہتا ہے اور میں اکیلی ان

دیواروں کو پاگلوں کی طرح گھورا کرتی ہوں۔" یک بیک وہ اداس ہو گئی۔

"کیوں؟ جیجاجی نہیں رہتے یہاں؟ اور بچے وغیرہ؟ یا کوئی رشتہ دار، یا ماں جی وغیرہ۔ کوئی نہیں؟" شیلا نے دریافت کیا۔

"چلو اب چلتے ہیں۔ سنجے آتے ہوں گے رات کے کھانے کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ ان دس برسوں میں بہت کچھ کھویا ہے میں نے، میری داستان بہت لمبی ہے۔ میں بعد میں تفصیل سے سناؤں گی۔ ابھی چلتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد بات کریں گے۔" رما اپنی کرسی سے اٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں کی بیمار ہو۔ چہرے پر کرب نمایاں تھا، جیسے وہ اپنی دلی کیفیت اور جذبات پر قابو پانے کی بھرپور جدوجہد کر رہی ہو۔

شیلا بھی ایک دم بجھ سی گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نہ جانے رما نے کون سا غم پال رکھا ہے اور نہ جانے پچھلے پندرہ برسوں میں اس نے کتنے دکھ جھیلے ہیں۔ اتنی خوب صورت کوٹھی، یہ لان میں دور تک پھیلی ہوئی خوب صورت کیاریاں اور مہکتے پھولوں کے تختے۔ اتنے دل کش ماحول میں رہ کر بھی وہ اتنی غم زدہ کیوں ہے؟

شام کے سات بج رہے ہوں گے کہ کال بیل بج اٹھی۔ رامو نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر پوچھنے لگا "کن سے ملنا ہے آپ کو؟"

"سنو آج دوپہر تمہارے ہاں میم صاحب کی ایک دوست آئی ہیں۔ ان سے کہو کہ سنجے صاحب آئے ہیں۔"

ابھی وہ اپنی بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ رما اور شیلا وہاں آ پہنچیں جیسے ہی سنجے کی نظر رما پر پڑی، اس نے فوراً کہا۔ "نمستے رماجی۔"

"نمستے۔ آئیے بھائی صاحب، اندر تشریف لائیے۔" رما نے کہا اور پھر رامو سے مخاطب ہوئی، "رامو! صاحب کا بریف کیس [illegible] والے کمرے میں رکھ آؤ اور

روم میں دیکھو کہ سب ٹھیک تو ہے۔ میرے وارڈروب سے ایک صاف تولیہ
لر باتھ روم میں رکھ آؤ۔"

"چلئے سنجے جی۔ آپ نہا کر پہلے تازہ دم ہو جائیے۔" شیلا نے کہا!

سنجے جب نہا کر تیار ہو آئے تو ان تینوں نے ڈائیننگ ہال کا رخ کیا،
ننگ ٹیبل پر مختلف ڈشیں سجی ہوئی تھیں ان تینوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔
بجے آرام کرنے اوپر کمرے میں چلے گئے اور شیلا اور رما نے باہر برآمدے کا رخ کیا

"ہاں تو رما، اب سناؤ تمہارے کیا حال چال رہے ان دنوں۔ میں نے
ں کیا ہے کہ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تم غالباً خوش نہیں ہو۔ کچھ بجھی بجھی
۔ آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"دیکھو شیلا، عورت کے لئے مادی آسائشیں، جیسے رہنے کے لئے خوب
ت بنگلہ، گھومنے پھرنے کے لئے کاریں، اور گھر میں ہر ہر قدم پر نوکر۔ یہی
چاہیئے۔ اسے دلی سکون چاہیئے۔ روحانی خوشی چاہیئے۔ جب اس کی روح ہی
ت نہ ہو تو اسے یہ ساری چیزیں خوشی نہیں دے سکتیں۔ میری ضد کے آگے
تے مجھے ایم۔ اے تک تعلیم دلائی، لیکن پھر بھی لاحاصل۔ جب میری پہلی
ی ہوئی تو میں بھی کافی مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن شادی کے صرف دو
بعد میرے پتی کا کار ایکسیڈنٹ میں دیہانت ہو گیا۔ وہ اپنے دفتری کام کے
۔ میں ٹور پر جا رہے تھے کہ ایک ٹرک سے ان کی کار جا ٹکرائی اور موقع پر ہی وہ
ن کے چار ساتھی ہلاک ہو گئے۔ وہ ایک انجینیر تھے۔ یہ کوئی دس سال پرانی
ہے۔ پھر میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہنے لگی۔ کچھ دن بعد میں نے بھی سروس
۔ اسی درمیان پتاجی کے ایک بہت پرانے دوست ان سے ملنے آئے۔ گفتگو کے
بات انہوں نے کہا کہ ان کے لڑکے کی پتنی کا اچانک دیہانت ہو جانے سے وہ
غم زدہ رہتا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے

کسی معقول سی لڑکی کی انہیں تلاش ہے کیوں کہ ان کی پتنی کو بھی سدھارے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ گھر میں کسی عورت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ جب کچھ ناشتہ اور چائے لے کر میں وہاں پہنچی تو پتاجی نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "رادھے شیام جی، یہ میری بڑی لڑکی ہے۔ یہ بھی آپ کے لڑکے کی طرح دکھی ہے۔ اس کے پتی کا بھی دیہانت ہو چکا ہے۔ یہ اب یہیں کے ایک کالج میں پڑھا رہی ہے۔" میں نے جب انہیں نمسکار کیا تو انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "بیٹی مایوس نہ ہو۔ بھگوان نے ہر مسئلہ کا حل رکھا ہے۔ بہت جلد تیری دکھی زندگی میں بھی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔" ان کی اپنائیت سے بھرپور باتیں سن کر میرا من تڑپ اٹھا اور میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میرے دل کا درد آنکھوں کی راہ سے بہتا گیا، یہاں تک کہ طوفان تھم گیا۔

رما کچھ دیر کے لئے خاموش ہوئی تو ماحول میں سوگواری سی چھا گئی۔ شیلا بھی دم بخود ایک ٹک رما کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر اپنی نگاہیں مرکوز کئے ہوئے تھی۔ پھر رما نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کچھ دن بعد پتاجی کے دوست پھر ہمارے گھر آئے اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے مجھے مانگ لیا۔ پتاجی انہیں مایوس نہ کر سکے۔ انہوں نے شاید یہی سوچا ہوگا کہ جہاں ہمارے سماج میں لڑکی کی دوسری شادی ایک نہ سلجھنے والا مسئلہ ہے وہاں جب ایک اچھے اور مال دار گھرانے کا رشتہ آئے تو اسے ٹھکرانا نہیں چاہیئے۔ اس طرح مجھے انیل کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ انیل واقعی ایک اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنی دوسری پتنی تصور نہیں کیا۔ اپنا پیار بے دریغ مجھ پر نچھاور کیا۔ کیا کمی تھی ان کے پاس؟ رہنے کے لئے خوب صورت کوٹھی۔ گھومنے کے لئے کاریں، گھر میں ہر طرح کا آرام اور ہر وہ چیز انہوں نے مجھے دی جس کی میں نے تمنا کی۔ ان کی پہلی پتنی سے دو بچے ہیں۔

لڑکی اور ایک لڑکا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہی دونوں ان کی زندگی کا حاصل ہیں۔
ب ہی کافی اسمارٹ اور سمجھ دار ہیں۔ اوٹی میں ایک اچھے اسکول میں زیر تعلیم
۔"

اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یوں لگتا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو۔ اندر ہی
گھلی جا رہی ہو۔ آخر تم نے اندر ہی اندر کون سا دکھ پال رکھا ہے؟ کیا کمی ہے
ے پاس؟ زندگی کی ہر آسائش تو تمہیں میسر ہے۔" شیلا نے کہا۔
"ہاں ہے۔ لیکن تم یہ تو جانتی ہی ہوگی کہ کوئی بھی عورت اس وقت تک
و مکمل تصور نہیں کرتی جب تک کہ وہ تخلیق کے درد سے آشنا نہ ہو جائے اور
یری بد قسمتی ہے۔ پرائی اولاد پرائی ہی ہوتی ہے، شیلا۔ پرائی خوشبو سے کوئی
نک محفوظ ہو سکتا ہے۔" رما نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"لیکن آخر تمہاری کوئی اولاد کیوں نہیں ہوئی۔ کس مرض کا علاج نہیں ہے
ں۔ تم کسی اچھی گینا کالوجسٹ سے مشورہ کیوں نہ کر لیتیں؟" شیلا نے کہا۔
"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہوا یوں کہ انیل اپنی پہلی پتنی سے دو بچے
، کے بعد ہی اپنا فیملی پلاننگ آپریشن کرا چکے تھے۔ یہ بات مجھے شادی کی رات
ھوں نے بتادی تھی اور کہا تھا کہ رما، میں تمہاری ہر تمنا پوری کر سکتا ہوں سوا
کے کہ تم ماں نہیں بن سکو گی اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔" اتنا کہتے کہتے رما
ک اٹھی۔

شیلا خود بھی بے قابو ہوئے جا رہی تھی، لیکن وہ رما کے کندھوں پر ہاتھ رکھے
چپ ہونے اور صبر کرنے کی تلقین کرتی رہی اور ساتھ ہی یہ بھی سوچتی رہی
تھی دنیا کی کوئی چیز بھی اولاد کی کمی کی تلافی نہیں کر سکتی اور پرائی خوشبو
ے میں پرائی ہی ہوتی ہے

ریزہ ریزہ چاندنی

خدا کی مرضی کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے!

آج وہ بہت اداس تھا مایوسی، فکر اور غم کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر صاف پڑھی جا سکتی تھیں وقت کی گردش نے اس کے چہرے کی ساری شادابی چھین لی تھی اور اس کا چہرہ کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ گرد آلود سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر پڑا سگریٹ پر سگریٹ جلائے جا رہا تھا سارا کمرہ سگریٹ کے دھویں سے بھرا پڑا تھا۔ اور ایش ٹرے ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑوں سے۔ ایسے میں شام ہو چکی تھی۔ باہر آسمان ابر آلود تھا اور موسم میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ہوائیں سرد لگ رہی تھیں۔ کمرے سے باہر کی فضا بھی مغموم اور سوگوار سی لگ رہی تھی۔ وہ بے سدھ بستر پر پڑا ایک ٹک کمرے کی چھت کو تک رہا تھا ایک ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ اور دوسرے میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کا پروانہ، وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی کے اٹھاون سال آج بیت گئے اور زندگی سے جنگ لڑتے لڑتے آج وہ تھک چکا ہے آج وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ بیتے ہوئے لمحوں کا محاسبہ کرے بھی تو کیونکر۔؟ اس کی زندگی تو لمحوں میں بکھری پڑی تھی۔ کرچی، کرچی، ریزہ، ریزہ۔ اٹھاون سال کے ایک ایک لمحہ کو وہ یکجا کرے بھی تو کیونکر۔؟

آج جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہو رہا تھا۔ تو وداعی جلسے کے بعد اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ "تم نے وقت کی قدر نہیں کی مسٹر عامر۔ آج جب تم ریٹائر ہو رہے ہو تو کاش ایسا ہوتا کہ تمہارا بھی ایک اپنا گھر ہوتا بیوی اور بچے ہوتے جو کہ تمہاری ریٹائیرڈ زندگی کا پرجوش استقبال کرتے۔ تمہارا جوان لڑکا ہوتا تو کہتا۔" ابو اب آپ کے آرام کے دن ہیں آپ آرام کریں۔ آج سے آپ کی ساری

ذمہ داریاں میری ہیں۔ اب گھر کی دیکھ بھال اور ضرورتوں کا خیال رکھنا میرا اولین فرض ہے اب آپ ساری فکروں سے آزاد ہو کر اپنی باقی ماندہ زندگی ایک آزاد پنچھی کی طرح گزار دیں" لیکن وہ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا۔ اس کے احساسات پر اس کے ساتھی نے کاری ضرب لگائی تھی وہ بہت حساس تھا اس کے ساتھی کے الفاظ، ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں بن کر اس کے حساس دل میں پیوست ہو گئیں۔ تب وہ کرب سے بل بلا اٹھا۔ اور آپے سے باہر ہو کر اپنے ساتھی پر برس پڑا۔ "بند کرو یہ بکواس۔ کہاں کا گھر کہاں کی بیوی اور بچے۔ کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ یہ سب جونک کی طرح تمہارا لہو چوس کر تمہیں دور بہت دور اپنے سے پرے پھینک دیں گے جیسے اب تم ان کے لئے کوئی بے کار سی، نہ کام آنے والی شے ہو سمجھے۔"!!
پھر وہ گھر آ گیا تھا۔

اب جب کہ وہ تنہا تھا اس کے ساتھی کے کہے ہوئے الفاظ اس کے سر پر ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے اور گونج بن کر اس کے ذہن میں ہلچل سی مچا رہے تھے "تم نے وقت کی قدر نہیں کی مسٹر عامر۔" تم نے وقت کی قدر نہیں کی مسٹر عامر۔"! وہ اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا واقعی یہ سچ ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ بہت دور نکل گیا تھا اور بیتے ہوئے لمحوں کا حساب کرنے لگ گیا تھا
!

وہ دن وہ آج تک نہ بھول سکا تھا۔ اس دن اس کے سر سے اس کی ماں کا ممتا بھرا آنچل اٹھ گیا تھا۔ کتنا رویا تھا وہ۔ بلک بلک کر روتا ہی رہا تھا۔ اس سے بڑی دو بہنوں نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اور سمجھائے جا رہی تھیں کہ مت رو۔ اللہ میاں نے جب ہمیں پیدا کیا ہے تو ایک دن اپنے پاس بلا بھی لیتا ہے۔ لیکن اس کا معصوم ذہن یہ فلسفیانہ بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ابو کے ہمراہ محلہ کے کچھ لوگوں نے اس کی ماں کو اللہ میاں کے حوالے کر آئے تھے۔

وہ اپنی ماں کی یاد میں کئی دنوں تک کھانا بھی برابر نہ کھا سکا تھا۔ ہر وقت اسے اپنی پیاری ماں یاد آتی رہی تھیں۔

کچھ دنوں بعد اس کے ابو اس کی خالہ ہی کو دلہن بنا کر گھر لے آئے۔ اس نے خالہ ہی کو ماں سمجھ کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دن گزرتے گئے ہر چیز معمول پر آتی گئی۔ اس نے سب کچھ بھلا کر پڑھائی میں دلچسپی لینی شروع کر دی ...... وہ جب میٹرک کا امتحان اول درجہ میں کامیاب ہوا تو اس کے ابو نے بہت شاندار جشن منایا۔ اس کی خالہ امی نے اسے اپنے کلیجے سے لگالیا تھا۔ وہ اس پر اپنی جان نچھاور کرتی تھیں وہ اب اپنی ماں کو آہستہ آہستہ بھولتا جارہا تھا۔ اپنی خالہ ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ میٹرک میں کامیاب ہونے کے بعد اس نے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ زندگی معمول پر چل رہی تھی پھر یکے بعد دیگرے اس کی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ وہ اب گھر میں تنہا تھا اپنے ابو اور خالہ امی کا لاڈلا بن کر پڑھائی میں مشغول رہا کرتا اور بہت خوش رہتا لیکن اس کی یہ خوشیاں دیر پا ثابت نہ ہو سکیں۔ اچانک ہی اس کی خالہ امی بیمار ہو گئیں۔ انھیں دل کا عارضہ ہو گیا تھا دل کے پہلے ہی دورے کو وہ برداشت نہ کر سکیں اور انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے جسد خاکی کو منوں مٹی تلے دبائے جب وہ لوٹ رہا تھا تو یوں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اس کائنات میں اب اس کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس کی حالت اس جواری کی سی تھی جو اپنا سب کچھ جوے میں ہار کر آرہا ہو۔ بوجھل بوجھل قدم رکھتا ہوا مایوس اور بے حال۔ وہ ایک بار پھر خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے بے انتہا آنسو بہائے اس کے بعد جیسے اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے ہوں پھر اس دن کے بعد سے اس نے کبھی اپنی آنکھیں نم نہ کیں چاہے کتنے ہی مصیبتوں کے پہاڑ اس پر کیوں نہ ٹوٹے ہوں۔

قدرت نے اس کے ساتھ ہر وقت ستم ظریفی ہی کی اس نے جب گریجویشن

اور وہ نگاہیں تھیں کوثر ناہید کی ۔ جو ایک ذہین طالبہ بھی تھی ۔ اور ایک بے حد سادہ فطرت اور خدا کے عطا کیے ہوئے حسن کا شاہکار بھی ۔ مزاجوں کی یکسانیت نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا اور یہ قربت آہستہ آہستہ محبت کا روپ دھارتی گئی تھی ۔ اس دور کا ایک ایک پل اس کے لیے اپنے اندر لطیف جذبات لیے ہوئے تھا ۔ ان دونوں نے محبت کے اظہار کا ایک نیا انداز اپنایا اور خاموش نگاہوں سے عہد و پیمان کیے ۔ اس کی زندگی کا یہ دور خود اسی کے الفاظ میں سنہری روشنائی سے لکھے جانے کے قابل تھا کوثر ناہید کے تئیں وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا اسے ناگوار گزرتا تھا ۔ یہاں پھر قدرت نے اس کے ساتھ ناانصافی کی ۔ جب اس نے یہ طے کیا کہ اپنے ابو کو اپنے اور کوثر ناہید کے جذبات سے آگاہ کرے گا تو اچانک ہی اس کے ابو بیمار ہو گئے اور اسے فوراً گھر پہنچنے کا تار ملا ۔ اور وہ اپنے وطن چلا آیا ۔ گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس کے ابو کی حالت بہت نازک ہے ۔ اپنی آخری سانسوں کے درمیان اس کے والد نے اپنی تیسری بیوی اور اس سے ہوئے دو لڑکے اور ایک لڑکی کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اسے سونپی ۔ اور چل بسے ۔ اپنے مرحوم باپ سے کیے ہوئے وعدوں کی سرگزشت میں اس نے کوثر ناہید سے کیے ہوئے وعدوں کو بھلا دینا اور اپنی محبت کا گلا گھونٹ دینا ہی مناسب سمجھا کیونکہ دو کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش بے سود تھی ۔ اپنے سارے خواب اور ارمانوں کو اس نے اپنے ابو کی لحد میں دفن کر دیا اور خود کو ان تین معصوم بچوں کے لیے وقف کر دیا پھر اس نے ان تین بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اس کی چھوٹی بہن نے جب شباب کی منزلیں طے کیں تو مناسب گھرانے میں اس کی شادی کر دی ۔ دونوں بھائی آج اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے ۔ پھر اس نے اپنے دونوں بھائیوں کی شادیاں رچادیں ۔ اور اب وہ لوگ اپنے اپنے بیوی بچوں میں مگن زندگی گزار رہے تھے ۔ جس کا خواب اس

جارہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح عامر نے اپنی زندگی کے بہترین اٹھاون سال کھو کر جیسے آج خود کو اندھیروں کے حوالے کر دیا تھا۔!! اور خود اپنی زندگی میں چاندنی بکھیرنے کا اس کا خواب اپنی تعبیر کھو چکا تھا اور ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ کرچی، کرچی، ریزہ، ریزہ۔

تیرے بنا بھی کیا جینا

کال بیل کی آواز جیسے ہی فضاؤں میں تحلیل ہوئی ثمرین جو اپنے بستر پر دراز کسی رسالہ کے مطالعہ میں غرق تھی چونک کر اٹھ بیٹھی اور رسالہ ایک جانب رکھتی ہوئی صدر دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے خاکی وردی میں پوسٹ مین کو کھڑا پایا۔ جو آج کی ڈاک میں سے ایک نیلے رنگ کا لفافہ نکال رہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا لفافہ اسے تھما دیا اور اپنی راہ لی۔ یہ لفافہ اس نے تھام تو لیا تھا لیکن اس کے ہاتھ اب لرزنے لگے تھے۔ بار بار اس کی نگاہیں اس موتی مانند تحریر پر پڑتیں تو وہ خوف زدہ ہو جاتی۔ ثمرین یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی ساری طاقت کسی نے سلب کر لی ہو۔ وہ خود کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے پیر جہاں تھے وہیں جم گئے تھے جیسے ان پر فالج کا حملہ ہوا ہو۔ اس کا وجود ٹوٹ کر بکھرنے لگا تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوسٹ مین نے کوئی خط نہیں بلکہ کوئی ایسی چیز اس کے ہاتھوں میں تھمادی ہو جس کی تپش سے اس کا وجود پگھلتا جا رہا تھا۔ اور وہ لمحہ بہ لمحہ خود کو کمزور اور بے بس سا محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر اس نے ہمت کی اپنے بکھرتے ہوئے وجود کو یکجا کیا۔ اور اپنی ساری طاقت ایک جگہ سمیٹ کر آگے بڑھنے لگی۔ اب اس کے قدم اپنی آرام گاہ کی جانب بڑھنے لگے تھے وہ جیسے تیسے اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اپنی خواب گاہ تک لے آئی اور بالکل ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح بستر پر گر پڑی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اور سیلنگ فین سے آتی ہوئی ہوا اسے فرحت بخش لگ رہی تھی۔ وہ آنکھیں

مونہ دے بہت دیر تک بستر پر لیٹی رہی ۔ نیلے رنگ کا لفافہ اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھا ۔ یہ خط کسی اور کا نہیں اس کے اپنے شوہر کاشف کا تھا جسے نیلا رنگ بہت پسند تھا ۔ اس کی ہر پسند میں اس رنگ کی آمیزش ہوا کرتی ۔ شادی کی رات اس نے جو انگوٹھی اسے پہنائی تھی ۔ اس میں جڑا پتھر بھی نیلے رنگ کا تھا ۔ پھر شادی کے بعد جو ساڑھی اسے تحفہ میں دی تھی وہ بھی نیلے رنگ ہی کی تھی بہت خوبصورت اور قیمتی ۔ اس کی تحریر بھی غضب کی خوبصورت تھی ۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سفید کاغذ پر موتی بکھیر دیے ہوں ۔ وہ بہت خوبصورت لکھتا ۔ بہت دیر تک وہ بستر پر دراز یہی سوچتی رہی کہ کاشف کا یہ خط جو کہ چھ ماہ کے عرصے میں پہلا خط تھا ۔ کھول کر پڑھے یا نہ پڑھے کیا لکھا ہوگا اس نے ۔ اسے کاشف سے جدا ہوئے پورے چھ مہینے ہو رہے تھے ۔ وہ خود اپنی مرضی سے اپنی سسرال سے میکہ چلی آئی تھی ۔ جب وہ اپنا مختصر سا بریف کیس تھامے اپنی خواب گاہ سے نکل رہی تھی تو کاشف جو کہ برآمدے میں بیٹھا اس کی ہر ہر حرکت کا جائزہ لے رہا تھا خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہا اس کی امی نے جب اسے روکنے کی کوشش کی تھی تو کاشف انھیں منع کر گیا تھا ۔ پھر وہ میکہ چلی آئی تھی ۔

بہت دیر تک وہ یوں ہی لیٹی رہی اور وہ سوچتی رہی کہ لفافہ چاک کرے یا نہ کرے ۔ اس پر خوف طاری تھا اور وسوسوں کے ناگ اپنے پھن پھیلائے اسے ڈسنے کے لیے تیار تھے ۔ کیا لکھا ہوگا کاشف نے اگر کوئی ایسی بات لکھ دی ہو ۔ جو ان دونوں کے بیچ کہیں ایسی دراڑ نہ ڈال دے جسے پھلانگنا اس کے بس سے باہر ہو تو کیا ہوگا ۔ لیکن فوراً ہی اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ ایسا نہیں لکھ سکتا ۔ کیوں کہ ان چھ مہینوں میں جو اس نے اس کے ساتھ گزارے تھے اس نے اسے بہت قریب سے جانا تھا ۔ وہ ایک بہترین شخصیت کا مالک تھا ایک بے حد پیار کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا وہ ۔ وہ بہت ہی نرم دل واقع ہوا تھا ہر ایک سے پیار کرنے والا

ہر ایک کا ہمدرد اور غمگسار۔ وہ اپنی ماں، بہن اور بھائیوں سے بھی بہت پیار کرتا تھا، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ثمرین کبھی کبھی اس سے ناراض ہو جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا پیار بٹ جائے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنی ماں۔ بہن اور بھائیوں کی محبت میں ثمرین کو نظر انداز کر جاتا اور یہ بات اسے بہت کھٹکنے لگتی۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے اس نے بالآخر لفافہ چاک کر ہی ڈالا۔ اور اندر سے نیلے رنگ کی ایک پرچی نکالی جس پر کاشف کی تحریر موتیوں کی مانند بکھری ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس تحریر پر تیزی سے پھیلنے لگیں۔ اس نے بڑی محبت سے اسے مخاطب کیا تھا۔

میری رفیق سفر ثمرین

السلام علیکم۔ خدا کرے کہ تم بخیریت ہو۔ تمہیں میرا گھر (جو کہ ہمارا گھر تھا) چھوڑے ہوئے تقریباً چھ مہینے ہو رہے ہیں اور ان چھ مہینوں کے انتظار کے بعد کہ شاید تم اپنی خیریت اطلاع ہی لکھ بھیجتیں، میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے تفصیلی طور پر جائزہ لیا ہے کہ میرے ساتھ گزارے ہوئے چھ مہینوں میں کہیں مجھ سے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہ ہوئی ہو۔ کہیں میں نے تمہارے ساتھ ناانصافی تو نہ کی ہو۔ میری محبت میں کوئی کمی تو نہ ہوئی ہو لیکن ثمرین چھ مہینے کے عرصہ میں کہیں بھی ایسا نہ ہوا جس سے تمہارے احساسات مجروح ہوئے ہوں تمہارے نازک دل کو ٹھیس پہنچی ہو۔ تمہاری ناراضگی کا سبب میں نہ جان سکا۔ تمہاری ناراضگی کس بنا پر ہے۔ کیا وجہ ہے اگر تم اس لیے ناراض ہو کہ مجھے اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے جو کہ میرا فرض ہے تو اس سلسلے میں تمہیں آگاہ کر دینا مناسب سمجھوں گا کہ ایک بیٹا ہونے کے ناطے یہ ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے کہ میں اپنی ماں، جس نے اپنی ہر چیز قربان کر کے ہمیں پروان چڑھایا، ہمیں اعلیٰ تعلیم دلائی، سماج میں اونچا مقام دلایا۔ ان کی محنتوں کے نتیجے میں آج میں اس

مقام پر پہنچا ہوں اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنی ماں سے محبت نہ کروں تو یہ ممکن نہیں اور میری چھوٹی بہن اور بھائیوں کی دیکھ بھال، ان کی ضرورتوں کا خیال اگر میں نہ کروں تو اور کون کرے گا۔ باپ کے مرنے کے بعد بڑا بھائی ہی باپ کی جگہ لیتا ہے اور اگر ثمرین تم یہ چاہتی ہو کہ میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں تو یہ ان سب سے ناانصافی ہوگی اور میں نہیں چاہتا کہ میں ان سے، اس طرح ناانصافی کر کے گناہوں کا مرتکب بنوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ پڑھ لکھ کر بہت بڑے انسان بنیں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کریں۔ اس کے لیے میں خود کو وقف کر دوں گا لیکن میں یہ بھی نہ چاہوں گا کہ ان سب فرائض کی تکمیل میں میں تم سے بھی ناانصافی اور کوتاہی برتوں۔ میں ہر ممکن کوشش یہی کرتا آیا ہوں کہ میں تمہارے حقوق بھی برابر ادا کرتا رہوں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تم مجھ سے کہتیں میں کوشش کرتا .... کہ تمہاری شکایت کا ازالہ ہو جائے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم اپنی شکایتوں کا بوجھ من ہی من میں پالتی رہیں اور جب تم اس بوجھ کو سنبھال نہ پائیں تو اس گھر کو چھوڑ گئیں جسے میں تمہاری رفاقت میں نمونہ جنت بنانا چاہتا تھا۔ ثمرین اگر ہر عورت تھوڑا سا ایثار، اور قربانی سے کام لے تو وہ شوہر کی رفاقت میں اپنے گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم اگر یہ چاہتی ہو کہ میں اپنوں کو یکسر نظرانداز کر دوں اور صرف تمہاری زلفوں کا اسیر بن کر رہ جاؤں تو سمجھ لو کہ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

ثمرین، زندگی ایک طویل سفر ہے جس میں کئی نشیب و فراز آتے ہیں اور اس طویل سفر کو طے کر کے منزل کو پانے کے لئے ایک اچھے ہمسفر کی ضرورت ہوتی ہے اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے لیے ایک اچھا ساتھی اور ہمسفر ثابت نہ ہو سکوں گا تو تمہیں حق ہے کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔ کوئی اور اپنی پسند کا ہمسفر اور ساتھی تلاش کر لو میں تو یہ نہ چاہوں گا کہ تمہارے علاوہ کسی اور کو اپنا ہمسفر بناؤں

اب یہ فیصلہ میں نے تم پر چھوڑ دیا ہے۔ کہ اگر تمہیں میرا ساتھ گوارا ہے تو فوراً چلی آؤ میں اپنی آنکھیں بچھائے تمہارے استقبال کے لیے تیار ہوں ورنہ تمہاری مرضی۔ پھر مجھے مجبوراً کوئی اور ہمسفر تلاش کرنا پڑے گا۔ جس کے لیے صرف تم ذمہ دار ہوگی۔ اب اجازت چاہوں گا۔ خدا حافظ!

تمہارا منتظر۔ کاشف!

خط ختم کرتے کرتے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ضبط کے بندھ توڑ کر رخساروں پر لڑھک آئے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور خود سے مخاطب ہوئی۔ کاشف اگر میں نے کوئی خط نہ لکھا تھا تو تم تو لکھ سکتے تھے تم مجھے منانے بھی تو آسکتے تھے۔ کاشف کیا قصور میرا ہی ہے کیا میں نے ہی غلطی کی ہے۔ اگر تم اس طرح سوچتے ہو تو ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہے تو تم میرے پاس آتے مجھے سمجھاتے، مناتے تو کیا میں تمہارے ساتھ نہ چلی آتی لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے کہ تم مرد ہو اور میں عورت۔ مرد ہمیشہ سے ہی اپنی بڑائی جتاتا رہا ہے اور عورت کو ہمیشہ ہی کمزور سمجھا گیا ہے۔ اسے صنف نازک کا نام دیا گیا ہے۔ کاشف تم نے بھی وہی کیا جو ہر مرد آج تک عورت کے ساتھ کرتا آرہا ہے۔ اپنی انا کا بھرم رکھنے کے لیے ہمیشہ ہی اس نے عورت پر دباؤ ڈالا ہے اور وہ بے چاری دبتی چلی آرہی ہے۔ اپنی انا کو سرعام نیلام کرتی ہوئی۔ لیکن کاشف تم تو دوسروں سے بہت مختلف تھے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اصول پسند انسان۔ لیکن آج تم نے بھی وہی راہ اپنائی ہے جو ایک غیر تعلیم یافتہ انسان اپناتا ہے۔ ممکن ہو تم کسی حد تک سچ ہی کہہ رہے ہو کہ تمہارے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہے جسے تم ہمت اور خود اعتمادی کے ساتھ اٹھانا چاہتے ہو۔ لیکن میں نے یہ کب کہا تھا کہ تم اس بوجھ کو سرے سے ہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکو۔ میں نے تو صرف یہ واضح کرنا چاہا تھا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تمہاری شریک حیات۔ تمہارے دکھ سکھ کی ساتھی۔

تمہاری رفیق سفر، جو تمہارے ہمراہ زندگی کے نشیب وفراز میں تمہارے قدم بہ قدم ساتھ چلتی ہوئی تمہیں منزل تک پہنچنے میں ممدومددگار ثابت ہوسکوں مجھے بھی تمہاری محبت کی تمہارے پیار کی ضرورت ہے۔ میری اپنی بھی کچھ آرزوئیں کچھ تمنائیں ہیں جو ہر لڑکی شادی کے بعد اپنے ہمسفروشریک حیات سے پورا کروانا چاہتی ہے اس لیے نہیں کہ وہ صرف اور صرف اس کا شوہر ہے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ اسے اپنا مجازی خدا بھی مانتی ہے اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس کی معمولی سے معمولی تکلیف پر خود پریشان ہو اٹھتی ہے۔ اسے اپنا سب کچھ تصور کرتی ہے۔ تو کاشف میں نے بھی یہی کیا تھا جسے تم غلط سمجھ بیٹھے، خیر۔ وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی گم صم سی چپ چاپ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے کاشف کا خط تکیہ کے نیچے رکھا اور باہر چلی گئی۔ شام ہونے لگی تھی۔ باہر نیلے آسمان پر سرمئی بادلوں کے ٹکڑے جابجا پھیلے ہوئے تھے، کہیں کہیں شفق کی لالی پھیلی ہوئی تھی اور پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ قطار در قطار اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھے۔ ثمرین انھیں بغور دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحہ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا کہ وہ تو اپنا آشیاں چھوڑ آئی تھی۔ کہیں وہ ٹوٹ کر بکھر جائے تو۔؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا اس کے دل نے گواہی دی۔ پھر وہ منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھونے کے بعد وہ کچھ فرحت محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی تو نصیبن بوا دوڑی چلی آئیں "کہو بیٹی کیا چاہیئے۔"؟

"بوا گرم گرم چائے پلاؤ۔" ثمرین نے فرمائش کی۔ "جی بہت بہتر بٹیا۔ ابھی کچھ ہی دیر میں حاضر کرتی ہوں۔" نصیبن بوا نے کہا اور باورچی خانہ کی جانب چل دیں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ گرم گرم چائے اور ساتھ میں مکھن لگے ٹوسٹ لئے حاضر ہوگئیں۔ ثمرین ٹوسٹ کھانے لگی پھر اس نے جب چائے ختم کی تو خود کو کچھ ہشاش محسوس

کرنے لگی۔ اس دوران نصیبن بوا بغور ثمرین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ثمرین سے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہیں پھر انہوں نے ثمرین سے پوچھا۔
" ثمرین بٹیا ایک بات پوچھوں اگر تم ناراض نہ ہو تو۔"! " پوچھو بوا کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ۔" ثمرین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

کس کا خط آیا ہے بیٹی۔ دراصل جب تم خط پڑھ رہی تھیں میں کسی کام سے تمہارے کمرے میں آئی تھی اور یہ دیکھ کر دروازے ہی میں ٹھٹک کر رہ گئی کہ تم بغور خط پڑھ رہی تھیں اور تمہاری آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔ میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر چلی آئی اور یہی سوچتی رہی کہ ہو نہ ہو یہ خط کاشف میاں کا ہی ہوگا۔"!

" ہاں بوا تم نے بہت ٹھیک سمجھا ہے یہ خط کاشف کا ہی ہے اور انہوں نے مجھے واپس آنے کے لیے لکھا ہے۔" ثمرین نے دھیمے لہجے میں کہا۔

پھر کیا سوچ رہی ہو بٹیا۔ دیکھو ثمرین بیٹی میں نے برسوں اس گھر کا نمک کھایا ہے تمہیں گودوں کھلائی ہوں۔ مالک اور مالکن کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں اور اب جب سے تم اپنی سسرال سے چلی آئی ہو وہ دونوں فکر مند ہیں۔ دیکھو بیٹی تم تو پڑھی لکھی ہو۔ اور میں ٹھیری جاہل اور گنوار لیکن میں نے بھی ایک زمانہ دیکھا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ گھر بنانے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے لیکن اگر مٹانا چاہو تو بڑی سے بڑی عمارت کم سے کم وقت میں مٹادی جاسکتی ہے اسی طرح آشیاں بننے کے لیے بھی ایک مدت چاہیئے لیکن جب بجلی گرتی ہے تو منٹوں میں مدتوں کے بنے آشیانے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میاں بیوی جب ایک دوسرے کو سمجھ کر زندگی گزارتے ہیں تو گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے دونوں آپسی سمجھ بوجھ اور مفاہمت سے کام لیں تو بڑی سے بڑی مشکل آسان ہو جاتی ہے اور گھر پیار کا مندر بن سکتا ہے۔ بیٹی کاشف میاں بہت نیک ہیں، بہت ہی سلجھے ہوئے ذہن کے مالک ہیں۔ تم دونوں کی جوڑی خدا

ہمیشہ بنائے رکھے بہت خوبصورت جوڑی ہے۔ بیٹی میری تم سے یہی التجا ہے کہ تم اپنے آشیانے کو ٹوٹنے سے بچالو۔ اب جب کہ کاشف میاں نے خود تمہیں بلایا ہے تو یہ موقع تم ہاتھ سے نہ جانے دو۔ فوراً چلی جاؤ۔ تمہارے اس عمل سے تمہاری ممی پاپا بہت خوش ہونگے۔ ان کے ذہنوں پر رکھا ہوا بوجھ ہٹ جائے گا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ اللہ پاک خوش ہوں گے کیوں کہ انہیں ملاپ پسند ہے جدائی نہیں۔"

نصیبن بوا نے بہت پیار سے ثمرین کو سمجھایا اور اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو اپنی ساڑھی کے آنچل میں جذب کرتی ہوئی ثمرین کو تنہا چھوڑ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

"نصیبن بوا چلی تو گئیں لیکن ثمرین کے لیے لحہ فکر چھوڑ گئیں۔ نصیبن بوا نے جو کچھ کہا تھا وہ صدفی صد سچ تھا وہ سوچتی ہوئی برآمدہ سے اٹھ آئی اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہو گئی۔ پھر اس کا ذہن پچھلے ایک سال کا طواف کرنے لگا۔

ثمرین، انصاری صاحب کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس سے بڑے دو بھائی اور تھے۔ جن میں بڑا بھائی امریکہ میں ڈاکٹر تھا اور چھوٹا بھائی سعودی عرب کی ایک مشہور تعمیراتی کمپنی میں بحیثیت سول انجینئر تھا۔ انصاری صاحب کا شمار شہر کی معزز ہستیوں میں ہوتا تھا۔ کوئی ادبی محفل ہو یا پھر دینی مزاکرہ یا سمپوزیم۔ ہر ایک میں انہیں مدعو کیا جاتا۔ وہ تھے بھی بہت ملن سار اور ہمدرد قسم کے۔ دونوں لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور لڑکی کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ ثمرین نے سائنس میں گریجویشن کیا تھا اور ساتھ ہی کمپیوٹر سائنس میں ڈپلومہ بھی۔ یہ ڈپلومہ تو بس وقت گزاری کے مشغلہ کے طور پر اس نے مکمل کیا تھا۔ پھر جب انصاری صاحب کے ایک بہت ہی عزیز دوست ہاشم صاحب کی وساطت سے کاشف کا رشتہ ثمرین کے لیے آیا تو انہوں نے ہاں کر دی۔ کاشف بہت ہی ہینڈسم پرسنالٹی کا مالک تھا ساتھ ہی پوسٹ گریجویٹ بھی۔ یونیورسٹی میں اکنامکس کا لکچرر تھا اور ساتھ ہی پرائیویٹ

فرمس کے لیے بحیثیت کنسلٹنٹ بھی کام کرتا تھا۔آمدنی اچھی تھی لیکن ذمہ داریاں بھی کچھ زیادہ ہی تھیں۔انصاری صاحب کے دوست ہاشم صاحب نے جب انہیں بتایا کہ کاشف آج جو کچھ بھی ہے وہ اس کی اپنی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کیوں کہ اس کے والد بہت پہلے گزر چکے تھے۔تو انھیں یہ بات بہت پسند آئی تھی کیوں کہ وہ زمانے کے سرد اور گرم سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔وہ اپنی ماں چھوٹی بہن اور دو عدد بھائیوں کا سہارا تھا۔وہ یہ ذمہ داری بہت خوش اسلوبی سے نبھارہا تھا انصاری صاحب نے سوچا کہ کاشف ایک ہونہار لڑکا ہے جس کا مستقبل ان کی نظر میں بہت ہی درخشاں تھا انہوں نے کسی اور سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور اپنے دوست ہاشم صاحب سے ہاں کہہ دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔اور ایک مبارک ساعت ثمرین دلہن بنی وداع ہوکر کاشف کے گھر چلی گئی۔

کاشف ثمرین سے بہت محبت کرتا تھا۔شادی کے ابتدائی دنوں میں جو وقت انہوں نے گزارا تھا وہ ثمرین کبھی بھی بھلا نہ سکتی تھی۔بے شمار تفریحی پروگرام کاشف نے بنائے تھے وہ دونوں خوب خوب گھوما کیے۔ان کی اپنی مرضی تھی۔ان کی اپنی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں وہ جو چاہتی وہ ہو جاتا جو فرمائش کرتی پوری ہوجاتی پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے وقت کا پنچھی لمحوں کے پر پھیلائے دنوں اور مہینوں کے افق پر پرواز کرتا گیا اور چھ ماہ اسی طرح بیت گئے۔ان ہی دنوں میں ایک دن کاشف نے اس سے کہا۔" ثمرین میں تمہیں کچھ ضروری باتیں بتانا مناسب سمجھتا ہوں۔وہ یہ کہ میری امی نے بہت تکلیف اٹھائی ہے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ابا کے انتقال کے بعد سے وہ ایک مشین کی طرح کام کرتی چلی آرہی ہیں۔معاشی تنگی کے باعث انہیں بہت کام کرنا پڑا ہے۔آج میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی کی محنت اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔میرے کندھوں پر اب ایک چھوٹی بہن دو چھوٹے

بھائیوں کی نگہداشت اور تعلیم کا بوجھ ہے اور میں اب یہ بھی چاہتا ہوں کہ گھریلو کام کے بوجھ سے امی کو چھٹکارا دے دوں اس لیے میری تم سے خواہش ہے کہ اب تم اس گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے لو اور امی کو آرام اور سکھ پہنچاؤ۔ اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے جس طرح کا تعاون اور مدد کی ضرورت ہے بلا جھجک کہتی رہو۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ تمہیں کوئی پرابلم نہ ہو اب مجھے تم سے تمہارے خلوص اور تمہاری محبت وچاہت کی ضرورت ہے۔" ثمرین نے اس کی ساری بات بہت دھیان سے سنی اور کہا۔ "کاشف میں تمہاری محبت کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم بے فکر رہو اب امی کو انشاء اللہ کوئی تکلیف اٹھانی نہ پڑے گی۔ میری یہی کوشش رہے گی کہ انہیں آرام وراحت ملے۔"

اس نے کاشف سے وعدہ تو کر لیا لیکن جب ذمہ داریوں کا بوجھ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ دراصل وہ ان باتوں کی عادی نہ تھی ایک آزاد پنچھی کی طرح اس نے اب تک اپنی زندگی گزاری تھی اس کے گھر میں ہر قسم کی سہولت تھی ماں باپ کی چہیتی اولاد تھی اور گھر میں ملازمین بڑی تعداد میں موجود تھے چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑے سے بڑا بس ایک حکم کی دیر تھی منٹوں میں پورا ہو جاتا۔ اس طرح کے ماحول میں پروان چڑھی ثمرین کچھ دن تو کام کا بوجھ برداشت کرتی رہی پھر ایک دن اس نے کاشف سے کہہ دیا۔ "کاشف، ایسا کب تک چلتا رہے گا۔ میں اب تھکنے لگی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ دن ممی پاپا کے پاس رہ آؤں تھوڑا بہت آرام بھی ملے گا اور پھر ممی سے ملے بہت دن بھی ہو رہے ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو کل صبح میں چلی جاؤں۔"

"ٹھیک ہے ثمرین لیکن تمہیں پتہ ہے نا کہ دو دن بعد عاطف کے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ اگر تم چلی جاؤ گی تو امی کو پریشانی ہوگی۔ کل صبح ضروری چلی جاؤ لیکن پرسوں شام تک لوٹ آنا تا کہ عاطف کو سہولت رہے۔" کاشف نے کہا تو

یک بیک اس کا موڈ بگڑ گیا وہ من ہی من میں سوچنے لگی کہ کاشف کو اس کی کوئی فکر ہی نہیں ۔ صرف اپنی ماں، بہن اور بھائیوں کے لیے ہی سوچتے رہتے ہیں ۔ گویا وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں ۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئی ۔

اور دوسرے دن صبح کاشف کے یونیورسٹی چلے جانے کے بعد امی سے اجازت لے کر میکہ چلی آئی ۔ یہاں اتفاق سے اس کی کزنس آئی ہوئی تھیں اس کی خالہ کی دو بیٹیاں دو دن کے بجائے اسے چار دن رک جانا پڑا ۔ اور جب کاشف اسے لینے آئے تو ان کا موڈ بہت خراب تھا ۔ ان کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وہ بہت جلد تیار ہو گئی اور ان کے ہمراہ چلی گئی ۔ گھر پہنچ کر کاشف اس پر بہت برہم ہوئے ۔ " تمہیں میں نے کہدیا تھا ۔ کہ دوسرے دن شام میں کسی طرح لوٹ آؤ لیکن تم نے وہی کیا جو تم چاہتی تھیں ۔ "!

نہیں کاشف آپ غلط سمجھ رہے ہیں ۔ دراصل میری خالہ زاد بہنیں آگئی تھیں تو ممی نے مجھے روک لیا میں چاہتے ہوئے بھی نا نہ کہہ سکی ۔ مجھے مجبوراً رک جانا پڑا ۔ اور پھر دو ہی دن کی تو بات تھی ۔ مجھے گئے ہوئے کوئی ہفتہ دس دن بھی تو نہ ہوئے تھے ۔ "! ثمرین کو بھی غصہ آگیا ۔

" بات دنوں کی نہیں ۔ بات ہے وعدہ خلافی کی ۔ " بات ہے شوہر کے حکم کی خلاف ورزی کی، بات ہے اس کے پاس کی لحاظ کی، اس کی عزت کی ۔ جس لڑکی کے دل میں شوہر کی عزت نہیں وہ بیوی کہلانے کے قابل نہیں سمجھیں یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے درگزر کیے دیتا ہوں ۔ لیکن آئندہ ایسی کوتاہی مجھے قطعی پسند نہیں " کاشف نے کہا اور خاموشی سے باہر چلے گئے ۔ وہ گم صم سی کاشف کے اس طرز تخاطب پر سوچتی رہی اور اپنے ہاتھ ملتی رہی ۔ بہت دیر تک اس کا موڈ بھی خراب رہا پھر وہ اٹھی اور وارڈروب کھول کر اپنے کپڑے جمانے لگ گئی ۔

پھر ایک بار یوں ہوا کہ اس کی ایک بہت ہی عزیز سہیلی کے لڑکے کی سالگرہ تھی اور اس تقریب میں وہ اور کاشف دونوں ہی مدعو تھے لیکن اتفاق ہی کی بات تھی کہ اس دن امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور کاشف نے ڈاکٹر گوئل سے وقت لیا ہوا تھا۔ ماں کو لے جانا تھا۔ جب صبح وہ یونیورسٹی جانے لگا تو ثمرین نے اسے یاد دلایا کہ آج شام انہیں نورین کے بچے کی سالگرہ تقریب میں شرکت کرنا ہے اس پر کاشف نے کہا۔ "ثمرین تمہیں پتہ ہے کہ میں نے ڈاکٹر گوئل سے وقت لیا ہوا ہے اور شام میں امی کو معائنہ کے لیے لے جانا ہے پھر اس نے کچھ دیر سوچا اور کہا۔ ثمرین تم کیوں نہ عاطف کے ساتھ چلی جاتیں۔ میری طرف سے اپنی سہیلی سے معذرت کر لینا پھر اس نے اپنی جیب سے سو روپیہ کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جاتے ہوئے راستے میں بچے کے لیے کوئی خوبصورت سا کھلونا خرید لو۔"!

"رہنے دیں یہ پیسے آپ اپنے پاس کوئی اور کام آجائیں گے۔ مجھے نہیں جانا ہے اب اس تقریب میں۔"! اس نے درشت لہجے میں کہا۔ اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ کاشف اسے بس دیکھتا ہی رہ گیا پھر وہ یونیورسٹی چلا گیا۔

اس رات ان دونوں میں بہت تکرار ہوئی۔ کاشف نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی اور کہا۔ "ثمرین تم ایک معمولی سی بات کو طول دے رہی ہو۔ میرے نزدیک اس سالگرہ تقریب سے زیادہ اہم ماں کا میڈیکل چیک اپ تھا۔ اور پھر میں نے بخوشی اس تقریب میں شرکت کی اجازت دے دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ عاطف کے ساتھ چلی جاؤ۔"!

"ہاں میں انہیں ساتھ لے جاتی اور اپنی بے عزتی کرواتی۔ میری اور بھی دوست اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ مدعو تھیں وہاں۔ کیا وہ لوگ یہ نہ پوچھتیں کہ میرے لیے آپ کے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں ہے تو میں کیا جواب دیتی۔"؟

"چلو مان لیا کہ وہ پوچھتیں لیکن تمہارے پاس معقول وجہ تو تھی ہی انہیں بتانے کے لیے تم وہی بتادیتیں۔" کاشف نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا تو اسے اور بھی غصہ آگیا اور وہ منہ پھیرے سو گئی۔

دوسرے دن صبح جب وہ اٹھی تو کل والی تلخی پھر اس کے ذہن میں ابھر آئی۔ اس نے ناشتہ کے بعد اپنے مختصر سے کپڑے بریف کیس میں رکھے اور باہر نکل گئی جب کاشف کی امی نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے انھیں منع کر دیا اور کاشف خاموش تماشائی بنا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔!

جب وہ اس طرح کاشف سے روٹھ کر میکہ آگئی تو اس کی ممی اور پاپا دونوں نے ہی اسے ڈانٹا لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ دو چار دن بعد دونوں نارمل ہوجائیں گے تو خود بخود سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ ماہ بیت گئے۔ ان دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی ہی گئی۔ فاصلے بڑھنے لگے تو ثمرین کے ممی پاپا اس کے لیے پریشان رہنے لگے۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا کہ جس طرح ثمرین اپنی مرضی سے آگئی تھی اسی طرح واپس بھی چلی جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اس کی یہی ضد تھی کہ اگر کاشف خود آکر اسے لے جائیں تب ہی وہ جائے گی۔ جیسے جیسے دن بیتنے لگے تب اسے یہ احساس ہونے لگا کہ ساری غلطی اسی کی تھی۔ اس نے واقعی کاشف کو تکلیف دی ہے اسے اس ایک معمولی بات پر اس طرح گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہئیے تھا۔ اب جب کہ وہ اسے آنے کے لیے لکھ چکے تھے تو یہ موقع واقعی اسے نہیں کھونا چاہئیے۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کل صبح چلی جائے گی۔ اسے نصیبن بوا کے کہے ہوئے الفاظ بار بار یاد آرہے تھے کہ آشیاں بنتے دیر لگتی ہے لیکن بکھرنے کے لیے بس چند لمحے چاہئیے رات بھر وہ بے چین سی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دوسرے دن صبح وہ نہا دھو کر تیار ہوئی اور ناشتہ کرنے کے بعد اپنا بریف

کیس سنبھالے ممی پاپا سے ملنے ان کی خواب گاہ پر دستک دینے لگی تو وہ دونوں ہی باہر نکل آئے اور جب اسے بریف کیس سنھالے کہیں جانے کے لیے تیار پایا تو پوچھنے لگے۔ "کہاں جارہی ہو بیٹی..... ؟"

"اپنے گھر۔"! اس نے مختصر سا جواب دیا اور ماں کے سینے سے لپٹ کر رو دی۔اس کی ممی نے اس کے آنسو اپنے ممتا کے آنچل میں جذب کیے اور کہا۔ "بیٹی صبح کا بھولا جب شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے جاؤ اور اپنے پیار کے آشیانے کو ٹوٹ کر بکھرنے سے بچالو۔"!

"جی بہت اچھا۔"! کہتی ہوئی جب وہ چلی گئی تو ممی پاپا کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی پھر وہ فوراً ہی خدا کے حضور سجدہ شکر بجالانے اپنی خواب گاہ کی جانب مڑ گئے۔

○

انعام

" حنا تم مجھے غلط مت سمجھو۔ دراصل اس معاملے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ امی ابا کی ضد کے آگے میں مجبور ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے باعث انہیں کوئی دلی تکلیف ہو۔ اس عمر میں وہ ذہنی الجھنوں سے دوچار ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ وہ جو چاہتے ہیں تم اپنے والدین سے کہہ کر انکے مطالبات کی تکمیل کروادو۔ یہی ان کی آرزو اور تمنا ہے۔" شارق نے حنا سے کہا۔

شارق یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اپنے والدین کو مجبور کروں کہ وہ امی ابا کے مطالبات کی تکمیل کردیں۔ یہ اب ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میری شادی میں لیئے گیئے قرض کے بوجھ سے ہی انہوں نے ابھی چھٹکارا حاصل نہیں کیا۔ اس پر مزید مطالبات نہیں۔ نہیں۔ یہ مجھ سے نہ ہوسکے گا۔!" حنا شارق کو اپنے والدین کی مالی حالت سے آگاہ کرتی ہوئے کہنے لگی۔!

" تمہارے والدین کی مالی حالت سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میرے والدین کی خوشی کے لیئے تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا۔ میرے ماں باپ کی بھی آرزوئیں ہیں تمنائیں ہیں۔ ہر والدین کی طرح انہوں نے بھی یہ آرزو کی تھی کہ ان کے بیٹے کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو۔ اوروں کی طرح ان کا گھر بھی جہیز سے بھر جائے۔ لیکن انہیں مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔ ان کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گیئے۔!" شارق نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

شارق کی باتیں سن کی حنا پریشان ہو اٹھی۔ اسے قطعی شارق سے ایسی امید نہ تھی۔ اس نے تو اپنے دل میں اسے ایک بے حد اونچا مقام دیا ہوا تھا۔ لیکن آج اس کے خیالات جاننے کے بعد اس کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی۔ اسکے احساسات کے

نازک آبگینے ٹوٹ کر پاش پاش ہو گئے تھے اور اس کی کرچیاں اس کے سارے وجود میں پیوست ہو کر اسے لہولہان کرنے لگی تھیں۔ اس کا سارا وجود ٹوٹ کر بکھرنے لگا پھر اس کے اندر غم و غصہ کی اک لہر سی اٹھی اور وہ بپھر گئی۔ اس نے شارق سے کہا "شارق میں نے آپ کو اپنے دل میں اتنا اونچا مقام دیا تھا کہ آپ کی سوچ کی پہنچ بھی وہاں تک نہ ہوتی اس لیئے کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہوتے ہوئے بھی آپ نے شادی کی منڈی میں اپنی بولی نہیں لگوائی تھی اپنا نیلام نہیں کروایا تھا۔ میں نے آپ کو ایک اعلیٰ ظرف انسان کے روپ میں دیکھا تھا اور چاہا تھا میں نے آپ کو مشعل راہ سمجھا تھا جو کہ جہیز جیسی لعنت کے بڑھتے ہوئے اندھیروں کو ختم کر کے سماج کو ایک نئی روشنی عطا کرے گی۔ میں نے آپ کو مینارہ نور سمجھا تھا۔ آپ تو سب سے مختلف تھے۔ آپکی عظمت کے گیت گائے تھے میں نے۔ لیکن شاید مجھ سے بھول ہو گئی آخر کار آپ بھی اسی ڈگر پر آپہنچے آپ بھی گندی نالی کے وہی کیڑے ثابت ہوئے ہیں جسے گندگی سے نکال کر اگر صاف ستھرا ماحول فراہم کیا جائے تو وہ اس ماحول میں سانس نہیں لے سکتا، اس ماحول کی پاکیزگی کو برداشت نہیں کر سکتا اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے۔ اسی گندے ماحول میں۔ آج آپ نے بھی ثابت کر دیا کہ آپ بھی اسی ماحول کے پروردہ ہیں آپ نے بھی اسی ماحول میں سانس لی ہے آپ بھی اسی گندی نالی کے کیڑے ہیں۔!

"تڑاخ۔۔۔" شارق کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور اسکے داہنے ہاتھ کی چاروں انگلیوں کے نشان حنا کے گلابی رخسار پر اتر آئے۔ وہ تڑپ اٹھی۔ درد کی شدت سے اس کی آنکھیں ابل پڑیں اور آنسوؤں کا ایک آبشار سا بہنے لگا۔ شارق کی گرجدار آواز فضاؤں میں گونجنے لگی۔ "زبان لڑاتی ہو کمبخت زبان کھینچ لونگا۔!" پھر وہ غصہ میں بھرا گھر سے باہر چلا گیا۔

حنا اپنے کمرے میں آئی اور کٹی ہوئی شاخ کی طرح بستر پر گر پڑی۔ اپنا چہرہ تکیہ

میں چھپا کر سسک پڑی اس کی آنکھوں سے سیل رواں بہہ بہہ کر تکیہ بھگونے لگا۔ وہ سوچنے لگی ایسے تو نہ تھے تم شارق پھر یہ تمہیں کیا ہوتا جارہا ہے۔ کتنے پیار سے بیاہ کر لائے تھے تم مجھے۔!

حنا شارق کی زندگی میں بہار بن کر داخل ہوئی تھی۔ بے انتہا خوبصورت۔ گلاب کی سی رنگت، کھڑا چہرہ، ستواں ناک۔ جھیل جیسی آنکھیں اور دراز زلفیں۔ وہ جب لپنے گھنے بال سنوارنے لگتی تو شارق کا دل ان میں الجھ الجھ جاتا۔ وہ والہانہ انداز میں انہیں چوم لیتا اور اسے خود سے بہت قریب کرتے ہوئے اس پر پیار کی بوچھار کرنے لگ جاتا۔ حنا دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوتی اور اللہ کے آگے سربسجود ہوکر مشکور ہوتی۔ اس کی سہیلیاں اس پر رشک کرتیں کہ اسے ایک اعلیٰ ظرف اور چاہنے والا شوہر ملا ہے حنا بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ شارق کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتی۔ اس کے والدین کی جی جان سے خدمت کرتی کہ ان ہی کی دعاؤں سے اسے اپنی جنت سنوارنی ہے۔ شادی کے بعد چند دنوں تک تو وہ بھی خوش تھے اس پر اپنی محبت نچھاور کرتے لیکن پھر رفتہ رفتہ ان کے سلوک اور رویئے میں نمایاں تبدیلی آتی گئی۔ وہ پہلے جیسی وارفتگی اب باقی نہ تھی۔ بے وجہ ہی اب اسے ساس کی ڈانٹ سننی پڑتی۔ پڑوسنوں کی بہوؤں کے حوالے سے اسے طعنے دیئے جاتے۔ ساس سسر کے برتاؤ کو تو خیر وہ نظر انداز بھی کر جاتی لیکن جب شارق کے برتاؤ مین بھی اس نے نمایاں فرق محسوس کیا تو اس سے برداشت نہ ہوسکا ایک دن اس نے اس سے پوچھ ہی لیا "شارق کیا بات ہے کہ آپ لوگ مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے ہیں کیا مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہے۔!"

"وجہ تم بخوبی جانتی ہو۔ پھر بھی مجھ سے پوچھ رہی ہو۔!" شارق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ میں نے تو کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی ہے۔ امی ابا کی ضرورتوں کا ہر وقت خیال رکھتی ہوں اور آپ کی خدمت میں

بھی، میں سمجھتی ہوں کوئی کمی نہیں کی میں نے حنا نے جواب دیا۔

"میں تمہاری خدمتوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ جہیز کے عنوان پر جو کچھ بھی تمہارے والدین نے دیا اس سے میرے امی ابو مطمئن نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح زمانے کا دستور ہے وہ تو کم از کم نبھایا ہوتا۔ لیکن تمہارے والدین نے انہیں بے حد مایوس کیا۔"

لیکن آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ شادی سے قبل آپ لوگوں نے کوئی مطالبات بھی نہیں رکھے تھے آپ لوگوں نے میرے ابو سے کہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی دیں گے اپنی لڑکی کو دیں گے۔ آپ کو اپنے لیئے کچھ اور نہیں چاہیئے۔!

"ہاں یہ سچ ہے لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ سرے سے کچھ دیا ہی نہ جائے۔ ہم نے سوچا تھا کہ ان دنوں جہیز کے عنوان پر لڑکی کو جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ تو دیا ہی جائیگا۔ لیکن تمہارے والدین نے جو کچھ دیا ہے وہ تو نہ کے برابر ہے یہی وجہ ہے کہ امی ابا شاید تم سے ناراض ہیں۔ شارق نے اپنی دانست میں معقول وجہ بتائی۔

"اگر وہ ناراض ہیں تو مجھے ان کی پروا نہیں لیکن آپ کی اپنی رائے کیا ہے اس بارے میں۔!"۔

"ظاہر ہے ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح میں ان کی رائے سے انحراف نہیں کر سکتا۔ ان کے احساسات کا خیال رکھنا ہی پڑے گا میرا اپنا نظریہ یا انداز فکر چاہے کتنا ہی الگ کیوں نہ ہو۔!

"مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے تعلیم یافتہ اور اونچے خیالات کے حامل نوجوان بھی جہیز جیسی سماجی برائی اور لعنت کو دور کرنے کی بجائے ظلمتوں کی اسی کھائیوں میں گرتے جا رہے ہیں جہاں سے اوپر اٹھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے تو یہ سماجی برائی آخر ختم ہو گی کیسے۔! حنا کا لہجہ تلخ ہو چلا تھا۔ یہ ساری باتیں کتابوں کے پنوں پر ہی ٹھیک ہوتی ہیں۔ میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں کہ اگر امی ابا کی خوشیوں

کا تمہیں لحاظ نہیں تو پھر سن لو کہ نتائج کے ذمہ دار تم اور تمہارے والدین ہوں گے ۔!" شارق نے اسے دبی زبان میں دھمکی دی اور آفس چلا گیا۔

اسی طرح کی بحث ان کے درمیان اکثر ہونے لگی ۔لیکن آج تو شارق نے حد ہی کردی ۔آج پہلی بار اس نے حنا پر ہاتھ اٹھایا۔اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکا تھا وہ اسکی اس بے رحمانہ حرکت پر وہ ٹوٹ کی بکھر گئی تھی ۔اسکا وجود اس ششیے کی مانند تھا جسے پکے فرش پر دے مارا گیا ہو جو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ بکھر گیا ہو ۔اس نے پھر اپنے بکھرے ہوئے وجود کو بڑی کو ششیوں سے یکجا کیا اور بستر سے اٹھ کر باتھ روم چلی گئی ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر جب کچھ تازگی محسوس ہوئی تو گھر کے کاموں میں جٹ گئی۔

شام میں جب شارق آفس سے لوٹا تو اسکا موڈ کچھ ٹھیک نہ تھا۔خاموش خاموش سا ۔اس نے کپڑے تبدیل کیئے اور باتھ روم چلا گیا ۔منہ ہاتھ دھو کر جب وہ برآمدے میں آبیٹھا تو حنا نے چائے کی ٹرے اسکے سامنے رکھ دی ۔جس سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی ساتھ ہی نمکین چیزیں بھی بنالائی تھی اس نے بے دلی سے کچھ نمک پارے منہ میں رکھے اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ابھی اس نے چائے ختم بھی نہ کی تھی کہ دروازے پر آٹو رکشا کے رکنے کی آواز سنائی دی ۔پھر چند لمحوں بعد ہی اس کی چہیتی اور پیاری بہن نورین برآمدے میں داخل ہوئی اور بھائی جان کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں جھول گئی ۔آنکھیں تھیں کہ ساون بھادوں برسا رہی تھیں ۔اسکے رونے کی آواز جیسے ہی سنائی دی شارق کے ماں باپ اور حنا تینوں وہاں آموجود ہوئے ۔پھر کیا تھا نورین ہر ایک کے سینے سے چمٹتی اور رونے لگتی ۔ بالآخر جب کچھ غبار چھٹا تو حنا نے دوڑ کر پانی لایا اسے پانی پلاکر آرام سے کرسی پر بٹھایا سب پریشان تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے تو نورین کہنے لگی عارف گذشتہ ایک ہفتہ سے مسلسل مجھے اس بات کے لیئے تنگ کر رہے ہیں کہ انہیں موٹر سائیکل خریدنے

کے لیئے بیس ہزار چاہیئے اور یہ رقم میں آپ سے مانگ کر لاؤں ۔ان کا کہنا ہے کہ یہ اندرون تین یوم اگر انہیں رقم مہیا نہ کی گئی تو نتایج اور عواقب کے ذمہ دار آپ ہوں گے اور بھائی جان آج تو عارف نے حد ہی کر دی ۔آج پہلی بار انہوں نے مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا اور اب گھر بھیج دیا کہ رقم لے کر ہی واپس لوٹوں ورنہ نہیں ۔!" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی ۔

شارق اور حنا نے مل کر اسے سمجھایا کہ اس بات کا زیادہ اثر نہ لے ۔وہ کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کر دیں گے ۔

آج دن بھر شارق رقم کے انتظام کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے رجوع ہوا ۔ قریبی دوستوں کے پاس عزیز رشتہ داروں کے پاس ہر ایک کے پاس دست سوال دراز کیا لیکن ہر جگہ اسے ناکامی ہی ملی ۔اسکی ہمت جواب دے گئی ۔ پھر شام ڈھلے وہ تھکا ہارا گھر واپس ہوا اس کے والدین اور حنا اور خود نورین ہر کوئی پر امید نگاہوں سے اس پر اپنی سوالیہ نظریں مرکوز کیئے ہوئے منتظر تھے کہ آج دن بھر کی کوششوں کا حاصل کیا ہوا ۔ کوئی امید بندھی کہ نہیں لیکن کافی دیر تک جب وہ خاموش رہا تو اسکے ابو احمد صاحب نے پوچھا "کیا ہوا بیٹا دن بھر کہاں رہے کوئی انتظام ہوا کہ نہیں؟

نہیں ابو ہر کسی نے معذوری ظاہر کی معذرت چاہی کہ وہ ہمارے برے وقت پر کام نہ آسکے ۔اور پھر ابو بیس ہزار کوئی معمولی رقم بھی تو نہیں ۔ ہر کسی کے پاس اتنی قطیر رقم یکمشت دستیاب ہو ناممکن نہ سہی تو مشکل ضرور ہے کہاں کہاں نہیں گیا میں دوست رشتہ دار خالہ ماموں چچا ہر ایک سے دست سوال دراز کیا لیکن لا حاصل ۔اسکے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی اسکی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کتنے کرب اور کس اذیت سے دوچار ہے حنا نے شوہر کی حالت دیکھی تو اس پر بے انتہا رحم آگیا اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا دفعتاً وہ وہاں سے اپنے کمرے

میں چلی آئی چند لمحوں بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت ڈبیہ تھی اس نے وہ ڈبیہ شارق کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا" یہ کنگن لیجئے بازار جائیے اور انہیں فروخت کر آئیے۔ پورے پچاس گرام وزنی کنگن ہیں فی الوقت ساری مشکل اس طرح آسان ہو جائیگی اور پریشانی دور ہو گی۔

شارق حیران حیران سا اسکی جانب دیکھنے لگا پھر اس نے کہا" لیکن حنا یہ کنگن ہی تو تمہارا واحد زیور ہے جو تمہارے والدین نے بڑی چاہتوں سے دیا تھا۔!

" اللہ نے چاہا تو اس سے اچھے کنگن پھر بن جائیں گے۔ آپ فوراً انہیں لیں اور بازار ہو آئیں" پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگی یوں کیجئے آپ پہلے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جائیے چائے پی کر پھر بازار جائیے گا" پھر وہ باورچی خانے کی سمت تیز تیز بڑھنے لگی۔

چائے سے فارغ ہو کر شارق بازار چلا گیا اور حنا کے کنگن فروخت کر کے رقم لے آیا پورے بائیس ہزار آئے تھے دوسرے دن صبح وہ نورین کے ہمراہ اس کی سسرال پہنچا رقم عارف کے حوالے کی اور چلا آیا۔ شارق اور اسکے والدین اور بہن نورین سب ہی حنا کے اس عمل سے بے حد خوش تھے اسکے اس ایثار اور قربانی کے باعث ان کی لڑکی کی زندگی اجڑنے سے بچ گئی تھی انہوں نے دبے الفاظ میں اس سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ شارق بھی اس سے بے حد شرمندہ تھا۔ اور حنا خوش تھی کہ اس کی چھوٹی سی قربانی سے دو گھر اجڑنے سے بچ گئے تھے۔

شارق نورین کو اسکی سسرال چھوڑ تو آیا تھا لیکن متفکر تھا کہ بعد میں عارف کا کیا ردعمل رہا ہو گا۔ آج شام وہ جلد گھر لوٹ آیا تھا کشادہ صحن میں کرسیاں بچھی تھیں حنا چائے کی ٹرے لے کر میز پر رکھ ہی رہی تھی کہ دروازے پر موٹر سیکل رکنے کی آواز سنائی دی۔ ان دونوں کی نگاہیں اسی جانب لگی تھیں کہ اسی لمحے نورین اور عارف داخل ہوئے۔ اور دونوں نے ایک آواز میں سلام کیا۔ ان کے

چہروں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ پھر نورین نے مٹھائی کا ڈبہ اپنی بھابی حنا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا" بھابی جان یہ رہی مٹھائی موٹر سیکل خریدنے کی خوشی میں "

"بہت بہت مبارک ہو عارف بھائی آپ دونوں کو" حنا خوش ہوتے ہوئے بولی۔

" ارے واہ بھابی آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ پہلے موٹر سیکل تو دیکھ لیجیئے پھر دیجیئے مبارکباد۔ کیوں بھائی جان!" عارف نے خاموش بیٹھے شارق کو گھسیٹا۔

" ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ چلو حنا پہلے موٹر سیکل تو دیکھ لیں۔" پھر اس نے عارف سے پوچھا" کونسی گاڑی خریدی ہے۔؟"

" شارق بھائی ہیرو ہانڈا ہے۔ پورے تنیس ہزار ہوئے ہیں۔!" عارف نے خوش ہو کر بتایا۔ پھر ان چاروں کا قافلہ دروازے کی سمت بڑھا۔ موٹر سیکل واقعی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ چاروں واپس آکر پھر وہیں بیٹھ گئے۔ حنا مٹھائی کا ڈبہ کھول کر انھیں مٹھائی پیش کرنے لگی۔ مٹھائی کا ایک ٹکڑا لیتے ہوئے عارف نے کہا

" حنا بھابی اگر میں ایک انعام آپ کو دوں تو آپ مجھے کتنی مٹھائی کھلائیں گی۔!"

" انعام اور مجھے۔ وہ بھلا کس لئے۔ ایسا کونسا کارہائے نمایاں میں نے انجام دیا ہے جو آپ مجھے انعام سے نوازنے لگے۔!" حنا نے انکساری کے ساتھ کہا۔

" بھابی جان آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میرے لئیے جو قربانی آپ نے دی ہے وہ کیا کم ہے۔ آپ نے دو، دو گھر اجڑنے سے بچائے ہیں۔ ایک گھر میرا اور ایک گھر میرے عزیز ترین بھائی کا۔!" نورین نے عقیدت بھری نظروں سے حنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" اور اسی کارنامے پر ہم آپکو انعام سے نوازتے ہیں۔ یہ رہا آپکا انعام۔" عارف نے خوبصورت سونے کے کنگن کی ڈبیہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔" دیکھ لیجیئے گا یہ وہی کنگن ہیں جو شارق بھائی نے دو دن قبل فروخت کیئے تھے۔!

پھر تمہاری موٹر بائیک ۔!" شارق حیران سا سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا۔
" وہ تو میں نے ایک ہفتہ قبل ہی خریدی ہے ۔ دراصل پچھلے ہفتہ جب میں یہاں آیا تھا تو آپ دونوں کی گفتگو میں نے سن لی تھی ۔ مزید جہیز کے لئیے آپکا حنا بھابی پر دباو ڈالنا مجھے اچھا نہ لگا۔ پھر میں نے اور نورین نے مل کر یہ پلان بنایا ۔ مجھے تعجب ہوا کہ نورین اتنی اچھی اداکاری بھی کر سکتی ہے ۔!" عارف نے بھرپور قہقہہ فضا میں اچھالتے ہوئے کہا تو شارق کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی جس میں شرمندگی کا عنصر بھی شامل تھا۔ پھر انہوں نے کہا" حنا مجھے معاف کر دو ، میں امی ابو کی باتوں میں آکر تم سے زیادتی کا مرتکب ہوا ۔!" تو حنا نے مسکراتے ہوئے چائے کی ٹرے سمیٹی اور جانے لگی تو اسکی آنکھوں سے دو موتی ٹپکے اور رخسار کا سہارا لے کر اسکے آنچل میں جذب ہو گئے ۔ کسی نے سچ ہی کہا ہیکہ کردار کی بلندی ہمیشہ نفع پہنچاتی ہے ۔

بہاروں کا موسم

کال بیل جب اچانک ہی بج اٹھی تو نائلہ پریشان ہو اٹھی اور عجیب وغریب وسوسے اس کے ذہن میں سر ابھارنے لگے۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی شاکر نے فون پر اسے بتایا تھا کہ مما کی طبیعت ہنوز خطرے سے باہر نہیں ہے اور یہ کہ انہیں انٹنسیو کیر وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ شاکر نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ انجم اور وہ دونوں وہیں ہسپتال میں رات گزاریں گے۔ پپو اور منی کو وہ سنبھال لے۔ گھر میں رحیمن بوا موجود تھیں۔ نائلہ نے ابھی کچھ دیر قبل ہی پپو اور منی کو بہلا پھسلا کر منایا تھا اور انہیں بہت ساری کہانیاں سنا سنا کر نیند کی وادیوں میں بھیجا تھا۔ رحیمن بوا بھی ابھی ابھی سوئی تھیں وہ خود نیند کے انتظار میں ایک ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ لیے اپنے بستر پر دراز پڑھنے میں مشغول تھی کہ اچانک کال بیل بج اٹھی۔ وہ اندیشوں میں گھری ہوئی تھی کہیں کوئی بری خبر لیے ہسپتال سے نہ آیا ہو۔ لیکن اس کے دل نے گواہی دی کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ چند لمحوں قبل ہی شاکر نے ہسپتال سے فون کیا تھا۔ پھر اب اتنی رات گئے کون آسکتا ہے۔ اس نے وال کلاک پر نظریں جمادیں گھڑی رات کے ساڑھے بارہ بجا رہی تھی اور سردیوں کے موسم میں یوں بھی شام جلد ہو جاتی ہے اور لوگ آٹھ نو بجے ہی اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں ان ہی خیالوں میں غلطاں وہ آگے بڑھتی گئی۔ اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ گھر کے سامنے ٹیکسی کار کھڑی تھی ایک پکی عمر کا شخص اپنا سامان کار کی ڈکی سے نکالنے میں مصروف تھا۔ بلو کلر کی جینز پینٹ اور ہلکے آسمانی رنگ کی ہاف سلائز جرسی میں اس کی شخصیت کافی مرعوب کر دینے والی لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے وہ بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔ اس نے سارا سامان نکال کر ٹیکسی

کا کرایہ چکایا اور جیسے ہی مڑ کر .... دروازے کی سمت دیکھا تو ایک اجنبی چہرہ چند لمحوں کے لیے اسے پریشان کر گیا۔ اس نے سوچا کہیں غلط پتے پر تو نہیں پہنچ گیا۔ اسی خیال کے زیر اثر اس نے اپنی جانب دیکھتی ہوئی نائلہ کو مخاطب کیا۔

"کیا سید شاکر علی یہیں رہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ لیکن آپ معاف کیجئیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" نائلہ کے لہجے میں پریشانی پنہاں تھی وہ سوچ رہی تھی نجانے کون ہوگا جو اس کے بہنوئی شاکر کو پوچھ رہا ہے۔

"دیکھئے محترمہ پریشان نہ ہوں۔ میں شاکر کا بڑا بھائی ہوں۔ اور ابھی ابھی امریکہ سے آرہا ہوں ایک عرصہ ہوا مجھے ہندوستان چھوڑے ہوئے۔ دراصل شاکر نے مجھے ...... اطلاع دی تھی کہ مماہت سریس ہو گئی ہیں۔ فوراً چلے آئیں تو میں چلا آیا... وہ آہستہ آہستہ بتا رہا تھا۔

نائلہ نے جیسے ہی سنا کہ وہ شاکر کے بڑے بھائی ہیں فوراً ایک جانب ہٹتے ہوئے کہنے لگی۔

"اندر تشریف لائیے میں ابھی رحیمن بوا کو اٹھاتی ہوں۔ وہ بے چاری ابھی ابھی سوئی ہیں۔ نائلہ رحیمن بوا کو اٹھانے لگی۔" بوا جلدی اٹھیئے پتہ ہے شاکر کے بڑے بھائی آئے ہیں امریکہ سے ہے۔"

"کون آیا ہے۔" رحیمن بوا اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ "شاکر کے بڑے بھائی امریکہ سے آئے ہیں۔ نائلہ نے دوبارہ انہیں بتایا۔

"کیا کہا شاکر کے بڑے بھائی آئے ہیں۔ امریکہ سے آئے ہیں۔ ساجد میاں آئے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا ذرا دیکھوں تو کیا واقعی ساجد میاں آئے ہیں۔" رحیمن بوا خوشی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ دوڑی دوڑی ڈرائنگ روم کی جانب لپکیں تو ساجد علی جو کہ منتظر تھے کہ کوئی آئے اور ان سے ملے رحیمن بوا

جن کی گود میں انہوں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور اپنا بچپن گزارا تھا اپنے سامنے دیکھ کر ... بے تحاشہ لپکے اور بوا بوا کہتے ہوئے آگے بڑھے ۔ اور انہیں اپنی آغوش میں لے لیا ۔ ساجد علی کو اپنے سینے سے لگائے رحیمن بوا رو پڑیں ۔

"کتنے برسوں کے بعد لوٹے ہو بیٹا ۔ اتنے سنگ دل تو نہ تھے تم ۔ تمہاری ہی یاد میں تڑپ تڑپ کر بیگم صاحبہ بیمار پڑ گئیں ۔ دل کے عارضہ میں مبتلا ہو گئیں اور تم اب آئے ہو جب کہ وہ موت سے لڑ رہی ہیں ۔

"کیا کرتا بوا ۔ وہاں میں ایسا الجھا رہا کہ واپسی مشکل مسئلہ بن گئی تھی ۔ مما اب کیسی ہیں ۔" ان کی آواز بھی کپکپا رہی تھی اور آنکھوں کے کنارے نم ہو چکے تھے ۔

بیگم صاحبہ پر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہیں ۔ شاکر میاں اور ان کی بیگم انجم بٹیا دواخانہ ہی میں ہیں ۔ بیگم صاحبہ کے پاس بس اب دعا ہی انھیں بچا سکتی ہے ۔ رحیمن بوا نے روتے ہوئے کہا ۔ پھر کچھ لمحے توقف کے بعد کہنے لگیں ۔

" ساجد میاں ایک طویل سفر کر کے تم آئے ہو تھکے ہوئے ہونگے ۔ پہلے ہاتھ منہ دھو لو اور دو لقمے کھا لو ۔ پھر اگر طبعیت چاہی تو دواخانہ ہو آؤ ۔ ورنہ آرام کرو ۔ صبح بھی جا سکتے ہو ۔

" جی بہت بہتر ۔ لیکن میں پہلے ہسپتال ہو آؤں گا ایک عرصہ بعد مما کو دیکھوں گا ۔ مما ہی کے لیے تو دوڑا دوڑا چلا آیا کہ نجانے وہ اب کیسی ہوں گی ۔"

" ٹھیک ہے بیٹا لیکن پہلے ہاتھ منہ دھو لو اور دو لقمے کھا لو پھر چلے جانا ہسپتال ۔ رحیمن بوا نے جب پیار سے کہا تو ساجد علی انکار نہ کر سکے اور باتھ روم کا رخ کیا ۔ گیزر سے آتے ہوئے نیم گرم پانی سے انہوں نے منہ ہاتھ دھویا اور چلے آئے اتنے میں رحیمن بوا کھانا لگا چکی تھیں ۔ عرصہ دراز کے بعد اصلی گھی اور اچار کا

مزہ جب انہوں نے چکھا تو ان کی بھوک کھل گئی اور انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ زمانہ دراز بعد آج انہوں نے خالص مشرقی کھانا کھایا تھا۔ فرائڈ رائز کوفتہ اور ماہی قلیہ تمام ڈشیں اتنی مزیدار تھیں کہ وہ بس اپنی انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ وہ جب کھانا ختم کر چکے تو رحیمن بوا نے پوچھا۔

"ساجد بیٹا کیا پیو گے۔ چائے یا کافی۔"

"چائے ہی پلوادیں۔" ساجد نے کہا اور واش بیسن کی جانب بڑھ گئے۔ رحیمن بوا چائے کی ٹرے لیے جب آئیں تو ساجد ہال میں ایک جانب بچھے تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے رومال سے اپنے ہاتھ خشک کر رہے تھے لو بیٹا ایک عرصہ دراز بعد ہندوستانی چائے کا مزہ لو۔" رحیمن بوا نے چائے کی پیالی انہیں تھماتے ہوئے کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی تھام لی۔ پہلی چسکی لیتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ واقعی چائے بہت شاندار بنی ہے۔ انہوں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔" واقعی چائے شاندار ہے مزہ آگیا۔ واقعی آپ نے چائے بہت خوب بنائی ہے۔"

" نہیں بیٹا یہ چائے میں نے نہیں نائلہ بٹیا نے بنائی ہے۔ بڑی سگھڑ اور پکوان کی ماہر ہیں۔ رحیمن بوا نے کہا۔

" معاف کرنا بوا میں نے انہیں پہچانا نہیں۔ نائلہ صاحبہ یہ محترمہ کون ہیں "ساجد نے استفسار کیا۔

" لو بیٹا میں بھی باؤلی ہو گئی ہوں بھلا تم انہیں کیسے جانو گے۔ یہ شاکر میاں کی سالی اور انجم بٹیا کی بڑی بہن ہیں۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ یہ دونوں ہی ہسپتال میں ہیں تو یہ یہاں گھر سنبھال رہی ہیں۔ بے چاری نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے اپنے بہن بھائی کے لیے۔ ایسا ایثار تو فرشتوں کو بھی شرما دیگا۔ بڑی دل والی ہمت والی ہیں نائلہ بیٹی۔ اپنی ساری خواہشات سارے ارمان ساری آرزوں کو مٹا کر بہن بھائی کو پروان چڑھایا۔ خود کو مٹا ڈالا دوسروں کے لیے ایسی قربانی واقعی

بے مثال ہے۔" رحیمن بوا نے نائلہ کا تفصیلی تعارف دے ڈالا۔

ساجد نے سنا تو حیران رہ گئے اتنی سادہ سی اور کمزور کمزور سی لگنے والی یہ لڑکی کیا اتنی ہمت والی بھی ہو سکتی ہے انہوں نے سوچا۔ پھر ان کے دل میں نائلہ کے لیے عظمت کا ایک نشان سا بنتا گیا۔ وہ چائے ختم کر چکے تھے۔ نائلہ باورچی خانے سے چلی آئی تو ساجد کو اپنا منتظر پایا۔ نائلہ صاحبہ کیا آپ ہسپتال کا پتہ بتا سکتی ہیں۔"

"کیوں نہیں کریسنٹ ہاسپٹل یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے آٹو رکشا سے بھی آپ جا سکتے ہیں۔" نائلہ نے انھیں بتایا تو ساجد اٹھتے ہوئے معذرت خواہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"ناحق آپ کو تکلیف ہو گئی ایک عرصہ بعد اتنی ذائقہ دار چائے پی ہے میں نے ساری تھکان دور ہو گئی بہت بہت شکریہ۔ میں ذرا ہسپتال جا کر مما کو دیکھ لوں تو کچھ سکون ملے گا خدا حافظ۔!"

ساجد جب باہر چلے گئے تو نائلہ نے صدر دروازہ اچھی طرح بند کر دیا اور چلی آئی۔ اپنے بستر پر دراز ہو کر لیٹی ہی تھی کہ ساجد کا سراپا اپنی تمامتر وجاہتوں کے ساتھ اس کے ذہن میں آموجود ہوا۔ بہت ہی چارمنگ پرسنالٹی تھی ان کی۔ ان کی لگ بھگ ۳۵ سال عمر ہو گی۔ لیکن ان کا چھریرہ بدن انہیں اپنی عمر سے کہیں چھوٹا بنائے دے رہا تھا۔ ان کا رک رک کر بات کرنے کا انداز نائلہ کو بہت بھلا لگا تھا وہ جب بات کرتے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی رہتی۔ ان کا انداز نرم ملایم اپنائیت لیے ہوئے تھا۔ شاکر کی عمر میں اور بھی ہینڈسم رہے ہوں گے اس نے سوچا پھر یک بیک وہ خود سے ہی مخاطب ہو گئی۔

یہ سب کچھ میں کیوں سوچنے لگی۔ تو فوراً ہی اس کے اندر کہیں ٹوٹ پھوٹ سی ہونے لگی۔ اس کے دل سے آواز آئی۔

"نائلہ کیا تم لڑکی نہیں ہو.... کیا تمہارے اپنے کوئی جذبات نہیں ہیں....

کوئی آرزو.... کوئی ارمان کوئی تمنا نہیں۔ کیا تم نے اپنے بارے میں بھی سوچا ہے کبھی۔ کیا کبھی جذبوں کی کسک محسوس نہیں کی۔ کیا کبھی نازک نازک احساسات نے تمہارے اندر جنم لینے کی کوشش نہیں کی کتنی نازک تھیں تم.... کسی کھلتی ہوئی گلاب کی کلی کی طرح نرم نرم کومل کومل۔ جو کوئی تمہیں دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ لیکن وقت کی آندھی ایسی چلی کہ تم سوکھے پتوں کی طرح ٹوٹ کر بکھرتی چلی گئیں۔ حالات کی دھوپ میں تپ کر اپنی ساری خوب صورتی۔ ساری کوملتا گنوا بیٹھیں۔ پھر خود کو دوسروں کے لیے وقف کر ڈالا۔ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کی چنگاریوں کو چھوٹی بہن اور بھائی کی محبت اور شفقت کی ڈھیروں راکھ تلے دبا ڈالا تاکہ وہ ابھر کر نہ آسکیں۔ کبھی تمہیں پریشان نہ کر سکیں اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ سب باتیں اس کے لیے اب کسی دیوانے کا خواب بن کر رہ چکی تھیں۔ اب اسے ان باتوں کے بارے میں سوچنے کا بھی حق نہ تھا۔" اس کے دماغ نے کہا آج نجانے کیوں اس کے دل کے اندر توڑ پھوڑ مچی تھی ایک عرصہ کے بعد کسی نے اس کے دل میں ہلچل مچادی تھی جیسے کسی نے جھیل کے پرسکون و ٹھہرے ہوئے پانی میں کئی کنکریاں دے ماری تھیں۔ جس کے باعث اس کے دل کی پرسکون جھیل میں اچانک ہی آرزوؤں اور ارمانوں کے دائرے دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ اچانک ہی اس کے دل کے شہر میں جو ظلمتوں میں گھرا ہوا تھا روشنیاں سی ہو گئی تھیں۔ ہر طرف ستارے سے ٹمٹما رہے تھے اچانک ہی کسی نے اس کے دل کے تار جھنجھنا دیے تھے اور موسیقی کی جیسے لہریں اس کے اندر اٹھ رہی تھیں۔ دور کہیں ریڈیو پر لتا منگیشکر کی آواز فضاؤں میں رس گھول رہی تھی۔

یہ کون آیا روشن ہو گئی محفل جس کے نام سے
میرے گھر میں سورج جیسے نکلا ہو شام سے

نائلہ بڑی مشکل سے ان خیالات سے پیچھا چھڑا کر سونے کی سعی کر رہی تھی

اور بار بار ناکام ہو رہی تھی بڑی کوششوں کے بعد نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوئی تو وہ نیند کی گہری وادیوں میں بھٹکنے لگی۔

صبح صادق موذن کی آواز نے جب کائنات کی فضاؤں پر اپنا تسلط جمایا تو وہ اٹھ بیٹھی وضو کیا اور خالق کائنات کے آگے سر بسجود ہو گئی۔ نماز سے فراغت کے بعد سورہ یسین کی تلاوت کرنے لگی۔ پھر اس نے صدق دل سے شاکر کی مما کی صحتیابی کے لیے دعا مانگی۔ اتنے میں رحیمن بوا بھی جاگ گئی تھیں اور کچن کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھیں نائلہ اٹھی قرآن پاک کو طاق میں رکھا اور کچن کا رخ کیا۔ "بوا رات ساجد صاحب ہسپتال سے لوٹے نہیں۔" اس نے بوا سے پوچھا۔

"ہاں نائلہ بیٹی لگتا ہے ساجد میاں نے رات وہیں کاٹی۔ برسوں بعد جب انہوں نے اپنی چہیتی ماں کو اس حال میں دیکھا ہوگا تو نجانے ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ بوا نے پریشانی سے کہا۔ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہنے لگیں۔ تقریباً دس سال بعد لوٹے ہیں ساجد میاں۔"

"جی ہاں بوا۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں دس سال کا عرصہ کوئی کم نہیں ہوتا۔ نجانے کتنے آندھی طوفان انسانوں کی زندگی میں آکر گزر جاتے ہیں اس عرصہ میں۔" نائلہ نے بھی افسردگی سے کہا۔ پھر وہ دونوں ناشتہ کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے کہ شاکر اور انجم گھر واپس آئے وہ لوگ آتے ہی رحیمن بوا اور نائلہ دونوں ہی نے مما کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ "اللہ کا فضل ہے کہ مما کی حالت اب خطرے سے باہر ہو گئی ہے لیکن انہیں ابھی اسی انٹینسو کیر وارڈ میں رکھا گیا ہے ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ دو ایک دن بعد انہیں عام وارڈ میں منتقل کیا جائے گا۔" شاکر نے کہا۔

"مالک کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ بیگم صاحبہ خطرے سے باہر ہو گئی ہیں۔" رحیمن بوا نے اپنے دونوں ہاتھ دعا مانگنے والے انداز میں اوپر اٹھا کر کہا پھر پوچھنے

لگیں۔ "شاکر میاں، ساجد میاں کہہ رہے رات بھر۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ سفر کی تھکان ہوگی آرام کر لیں۔ صبح بھی دواخانہ جاسکتے ہیں لیکن وہ مانے نہیں بیگم صاحبہ کو دیکھنے بے چین ہو کر چلے گئے۔"

"ہاں بوا۔ بھائی جان ہسپتال ہی میں ٹھہرے رہے۔ رات بھر باہر ویٹنگ ہال میں ٹھہرے رہے مما کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔ بہت جذباتی ہوگئے تھے شاید طویل مدت کے بعد مما کی محبت ہی انھیں یہاں کھینچ لائی ہے ویسے بھی وہ شروع سے ہی بہت حساس تھے.... ہر کسی کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا ان کی طبعیت کا خاصہ ہے۔ ہر کسی کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھ بیٹھتے ہیں اور اسے دور کرنے کی سعی میں لگ جاتے ہیں۔ میں نے بھی انہیں بہت کہا کہ آپ سفر کے تھکے ہوئے ہیں گھر جاکر آرام کریں ہم لوگ یہاں موجود ہیں۔ لیکن نہیں مانے وہ رات بھر یا تو ٹہلا کیے یا بیٹھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دی۔

"باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی پانی گرم ہے پہلے تم دونوں نہالو۔ ناشتہ تیار ہے پھر دواخانہ جاکر ساجد صاحب کو بھی تو گھر بھیجنا ہے بے چارے رات بھر نجانے سوئے بھی ہیں یا نہیں نائلہ نے باورچی خانہ سے آکر ان لوگوں کی گفتگو ختم کی... تو شاکر اور انجم وہاں سے اٹھ گئے۔

شاکر جب نہا کر تیار ہو گیا تو سیدھا ڈائیننگ ٹیبل پر چلا آیا۔ جہاں رحیمن بوا نے ناشتہ لگا دیا تھا۔ انجم باتھ روم میں تھی۔ شاکر نے جلدی جلدی ناشتہ ختم کیا اور تھرماس میں دودھ لے کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو گیا۔ انجم باتھ روم سے نکلی تو شاکر دواخانہ جاچکے تھے۔ رحیمن بوا نے اسے بتایا کہ شاکر میاں جاچکے ہیں۔

"بوا بچوں نے باجی کو رات میں تنگ تو نہیں کیا۔" انجم پوچھنے لگی۔

"نہیں بیٹی۔ نائلہ بٹیا نے انہیں بہلا پھسلا کر بہت جلد سلادیا تھا اور دونوں ہی اب تک آرام سے سو رہے ہیں۔

چلو اللہ کا کرم ہے انہوں نے باجی کو نہیں ستایا۔ رات بھر یہی فکر مجھے پریشان کیے دے رہی تھی۔" پھر وہ اور نائلہ دونوں ناشتہ کی ٹیبل پر جا بیٹھے اور ناشتہ کرنے لگے کھانے کے دوران انجم نے پوچھا۔

"ساجد بھائی جان رات کتنے بجے گھر پہنچے۔"

" کوئی ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ انہوں نے جب کال بیل بجائی تو میں واقعی پریشان ہو گئی تھی نجانے اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ پھر اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے میں نے دروازہ کھولا تو سامنے بالکل اجنبی چہرہ تھا۔ میں دم بخود انہیں دیکھتی رہ گئی۔ وہ میری پریشانی بھانپ گئے اور فوراً ہی اپنا تعارف دے ڈالا۔ تب کہیں جا کر میری جان میں جان آئی۔ دراصل نہ انہیں کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی ان کی تصویر۔" نائلہ نے تفصیل سنائی۔

" میں نے بھی انھیں پہلی بار دیکھا ہے۔ صرف تصاویر ہی دیکھی تھی ان کی۔ ہماری شادی میں بھی وہ شرکت نہ کر سکے تھے۔ اور اب تو ہماری شادی ہوئے چھ سال ہو رہے ہیں ہم دو بچوں کے والدین ہو گئے اور اب وہ آئے ہیں وہ بھی مما کی بیماری کا سن کر ورنہ شاید ابھی بھی نہ آتے یہ کمبخت امریکہ میں ایسا کیا رکھا ہے جو جاتا ہے وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔" انجم نے کہا۔ پھر پوچھا۔" رات انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی یا نہیں۔"

" کیسی بات کرتی ہو بیٹی بھلا انہیں ہم بھوکے ہی دواخانہ بھجوا دیتے۔" بوا نے چاول کی ڈش میز پر رکھتے ہوئے کہا۔" کھانے کے بعد لذیذ ذائقہ دار چائے بھی پلوائی تھی نائلہ بیٹی نے، چائے پی کر کہنے لگے۔ برسوں بعد اتنی شاندار اچائے پی ہے میں نے" بوا نے مزید تفصیل بتائی۔

" سچ باجی۔" انجم چھوٹی بچی کی طرح خوش ہو کر پوچھنے لگی تو نائلہ نے ہنس کر دھیرے سے اپنا سر خم کیا۔

"باجی واقعی آپ کے ہاتھوں میں جادو ہے جس چیز کو ہاتھ لگاتی ہو وہ شاندار ہو جاتی ہے۔ چاہے پکوان لے لو یا کڑھائی بنائی۔ پڑھانے میں تو آپ کا ثانی شاید ہی کوئی ملے۔ ہر فن مولا ہیں میری باجی۔"۔ انجم خوش ہوتی ہوئی کہنے لگی۔

"چل رہنے دے یہ مسکہ پالش۔ بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ سب اوپر والے کا کرم ہے۔ نائلہ نے انکساری سے کہا۔

"تم تو میری بہت ہی پیاری پیاری سی بہن ہو اب میں تمہارے لیے اتنا بھی نہ کروں تو لعنت ہے مجھ پر۔"

"باجی دعا کریں کہ مما بہت جلد صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئیں۔ پپو اور منی تو ان کے بنا رہ نہیں پائیں گے بہت لاگو ہیں اپنی دادی امی کے۔ رات بھر میں اللہ پاک سے یہی دعا کرتی رہی کہ مما کی عمر دراز کرے اور انہیں مکمل صحت عطا کرے۔ وہ مجھے بھی بہت چاہتی ہیں۔ بہو تو کبھی سمجھا ہی نہیں انہوں نے مجھے۔ بیٹی سے بڑھ کر چاہتی ہیں مجھ کو۔ خدا ہر بہو کو ایسی ہی مما جیسی ساس عطا کرے۔" وہ دعائیہ انداز میں کہنے لگی تو نائلہ نے آمین کہا۔

صابرہ خاتوں ایک انتہائی نرم دل اور نیک صفت خاتوں تھیں۔ دو ہی اولادیں تھیں ان کی سید ساجد علی اور سید شاکر علی۔ دونوں لڑکے واقعی بد قسمت تھے کہ ان کے سروں سے باپ کا شفیق سایہ بہت جلد اٹھ گیا تھا۔ ان کے والد محکمہ تعمیرات میں انجنیئر تھے۔ شاکر کی پیدائش کے دو سال بعد ہی انہوں نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا انہیں دل کا عارضہ تھا۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ مرحوم بے انتہا خصوصیات کے مالک تھے بہت نیک انسان تھے ہر ضرورت مند کی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرتے۔ بیوی کے لیے سایہ دار درخت کے مانند تھے تو بچوں کے لیے ٹوٹ کر چاہنے والے مشفق باپ۔ لیکن قانون قدرت کے آگے بھلا کسی کی کبھی چلی ہے۔ اللہ تعالی کی مصلحت وہی جانے۔ صابرہ خاتون بھری جوانی میں بیوہ ہو گئیں بیوگی کا

داغ دامن پر لگ گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے نام ہی کی طرح صابر تھیں اور اللہ کی مرضی کے آگے سربسجود ہونے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ضبط و تحمل اور صبر وسکون کا بے مثال مظاہرہ کیا اور اپنی جوانی دونوں لخت جگر ساجد اور شاکر کی پرورش پر نثار کر دی مفلسی کی تپتی دھوپ میں صبر اور ہمت کی چادر تانے وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئیں۔ انہوں نے ایک ٹیلرنگ انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ اور دن رات اس کی ترقی میں جٹ گئیں۔ خدا کی مدد جب شامل حال ہوئی تو ان کے معاشی مسائل آہستہ آہستہ حل ہوتے گئے۔ دونوں لڑکوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلائی بڑا لڑکا ساجد نے جب سائنس کی ڈگری حاصل کر لی تو اس کی ضد کے آگے جھک کر اسے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے امریکہ جانے کی اجازت دیدی۔ ساجد امریکہ جو گیا تو اس کے لیے لوٹ کر آنا مشکل ہو گیا۔ وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ صابرہ بیگم رات رات بھر جاگ کر اس کے لیے اپنے مالک حقیقی سے دعائیں مانگا کرتیں۔ رو رو کر راتیں کاٹتیں۔ اپنے ہر خط میں اسے واپس لوٹ آنے کی تلقین کرتیں۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ ساجد اپنے ہر خط میں وعدہ تو کرتے کہ بہت جلد لوٹ آؤں گا لیکن آ نہیں پاتے۔ وہ کن مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے خطوط میں ذکر نہ کیا تھا۔ ہر خط میں ماں سے معافی مانگتے کہ وہ انہیں کوئی سکھ نہ پہنچا سکے۔ اور درخواست کرتے کہ ان کے لیے دعا ضرور کریں۔ اپنے چھوٹے بھائی شاکر کو نصیحتیں لکھتے کہ ماں کا ہر لحاظ سے خیال رکھنا.... انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ وغیرہ... وغیرہ......"

ادھر شاکر نے بھی انجنیئرنگ میں ڈگری حاصل کر لی تھی اور اسے اچھی سی ملازمت مل گئی تو صابرہ خاتون نے اس کی شادی کر دی۔ بڑے بیٹے کی شادی کا ارمان تو دل ہی، دل میں رہ گیا تھا۔ تو انہوں نے چھوٹے بیٹے شاکر کی شادی میں اپنے سارے ارمان پورے کر لیے تھے اور انجم کو بہو بنا کر لے آئے۔ انہوں نے پہلے

دن ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ انہیں کبھی اپنی ساس نہ سمجھے وہ اس کی ماں ہیں اور انجم ان کی بیٹی ۔ ادھر انجم بھی بن ماں باپ کی لڑکی تھی اس نے بھی ماں کی ممتا دیکھی نہ تھی ۔ جب وہ صابرہ خاتون کی محبت کی شفیق چھاؤں تلے آئی تو ان کی محبت میں نہال ہو اٹھی ۔ اس نے تو اپنی بڑی بہن نائلہ ہی سے ماں جیسی محبت پائی تھی اور اب ماں کا پیار بھی اسے صابرہ خاتون سے ملا تو وہ اپنے مقدر پر نازاں اپنے خدا کی مشکور رہنے لگی ۔ وقت کا کارواں آگے بڑھتا گیا دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شادی ہوئے چھ سال بیت گئے ان چھ سالوں میں اس کے چمن زندگی میں ایک پھول پپو کی شکل میں کھلا اور ایک کومل سی کلی منی کی شکل میں کھلی تو اس کی زندگی میں بہار سی آگئی ان دو پھولوں کی خوشبو سے اس کے گھر کا ہر گوشہ مہک اٹھا ۔ اس کے گھر میں ان کی کلکاریاں گونج اٹھیں تو وہ اور شاکر مسرور و شاداں ہو گئے ۔ صابرہ خاتون دادی بنیں تو خوشی سے نہال ہو گئیں ۔ پوتا پوتی انہیں عزیز از جان تھے وہ بھی مسرور تھیں لیکن ایک خلش کانٹے کی طرح ان کے دل میں چبھتی رہتی کہ کاش ساجد بھی لوٹ آتے تو وہ اس کے سر پر بھی سہرا سجا دیتیں انہیں بس ساجد کی فکر ہی کھائے جاتی ۔ وہ ان کے لیے اتنی فکر مند رہتیں کہ رات کے کسی حصے میں اگر نیند سے جاگ پڑتیں تو ساجد ہی ان کے خیالوں پر چھائے رہتے اور وہ رو رو کر اپنا تکیہ بھگو لیتیں بیٹے کی اسی فکر نے آج انہیں دواخانہ پہنچا دیا تھا ۔ دل کے عارضہ میں مبتلا ہو گئی تھیں ان کی اس حالت کی خبر جب شاکر نے بڑے بھائی ساجد کو دی تو وہ فوراً چلے آئے ۔

صابرہ خاتون کی صحت جب کچھ سنبھل گئی تو انہیں عام وارڈ میں منتقل کیا جانے لگا لیکن شاکر اور ساجد نے ایک آرام دہ پیئنگ روم میں انہیں منتقل کروا دیا انہیں جب ہوش آیا اور حالت کچھ سنبھلی تب ساجد ان کے قریب گئے اور آہستہ آہستہ انہیں آواز دینے لگے مما.... مما پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ سہلانے لگے ۔

صابرہ خاتون کی سماعت سے جب ایک نئی آواز ٹکرائی تو انہوں نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر ساجد پر مرکوز کر دیں اور جیسے ہی ساجد پر ان کی نگاہ جمی خوشی اور... انبساط ان کے پرنور چہرے پر چمکنے لگا اپنی نازک حالت سے بے خبر خوشی کے بے انتہا احساس کے زیر اثر وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن ساجد فورا انہیں سہارا دے کر لٹا دیا۔ اور کہا۔ "بس آپ لیٹی رہیے آپ بہت کمزور ہو گئی ہیں

"تم کب آئے ساجد بیٹے۔" تمہارے لیے ہی میں تڑپ تڑپ کر یہاں آپہنچی تب کہیں جاکر تمہارا پتھر دل پگھلا اور ماں کا خیال آیا۔۔ ان کی آواز بھاری ہونے لگی اور ان کی پلکوں پر آنسو تیرنے لگے۔"

"نہیں مما روئیں نہیں آپ کا یہ نالائق بیٹا اب آپ سے کبھی جدا نہیں ہوگا میں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس لوٹ آیا ہوں مما۔" ساجد بھی جذباتی ہو گئے تھے ان کی پلکیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ پھر انہوں نے جیب سے رومال نکالا پہلے ماں کی آنکھیں صاف کیں پھر اپنی آنکھیں خشک کیں پھر صابرہ خاتون کو بتانے لگے۔

"شاکر نے فون پر اطلاع دی کہ آپ کی حالت بہت سریس ہے فورا چلے آؤں تو میں نے ایمرجنسی ویزا حاصل کیا اور اپنا سامان سمیٹ کر چلا آیا آج پورے چار دن ہو رہے ہیں مجھے انڈیا آئے ہوئے۔

"بہت اچھا کیا بیٹا تم نے میں ہمیشہ ہی تمہارے لیے تڑپتی رہی ہوں۔ ہمیشہ تمہارا وجود ہی میرے خیالوں کا محور رہا ہے۔ نجانے تم کیسے ہوگے۔ تنہائی تمہیں کیسے ڈستی ہوگی کوئی ہمدرد کوئی غمگسار بھی ہوگا کہ نہیں۔ ہر پل ہر لمحہ میرے تصور سے بس تم ہی چپکے رہے ہو تمہارے لیے اتنا روئی ہوں کہ آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے ہیں بینائی بھی اب ساتھ چھوڑنے لگی ہے۔ اللہ تعالی سے بس یہی دعائیں مانگا کرتی کہ مرنے سے قبل بس ایک بار تمہیں اپنے پاس اپنے قریب

دیکھوں تو ان پیاسی آنکھوں کی پیاس بجھ جائے دل کو سکون میسر ہو اور بے فکر ہو کر مروں ۔" صابرہ خاتون پھر رونے لگیں ۔

" بس مما بس کیجئیے اب ۔ مریں آپ کے دشمن خدا کرے کہ میری عمر بھی آپ کو مل جائے ۔ اب جب کہ میں ہمیشہ کے لیے آپ کے شفیق آنچل کے سائے میں رہنے کے لیے آیا ہوں ایک عرصہ آپ سے دور رہا ہوں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا آپ کو کوئی خوشی کوئی سکھ نہ پہنچا سکا یہ میری بد نصیبی ہے لیکن مما اب آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں جلد گھر لوٹ چلیں پھر آپ کی ہر خوشی ہر آرزو اور ہر تمنائیں پوری کرنیکی کوشش کروں گا ۔ ساجد نے انہیں دلاسہ دیا ۔

" ارے پگلے ایک ماں کی اس سے بڑی آرزو اور خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھے جس طرح شاکر اپنی گھر گرہستی کی خوشیاں سمیٹ رہا ہے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اب اپنا گھر بسا لو ۔ ماں کی آنکھوں میں ممتا کی چمک عود کر آگئی اور خوشیوں کے سائے جیسے ان کے چہرے پر لہرانے لگے ۔

آپ جیسا چاہتی ہیں انشاء اللہ ویسا ہی ہوگا لیکن آپ پہلے صحت یاب تو ہو جائیں ۔ ساجد ماں کے ہاتھ... آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہنے لگے ۔

" مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بیٹے جس کے لیے بیمار ہوئی تھی وہی جب آگیا ہے تو بھلا مجھے کوئی اور بیماری کیا ہو سکتی ہے اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی اور اپنے ان ہی ہاتھوں سے تمہارے سر پر سہرا سجاؤں گی " ۔ وہ بیٹے پر نثار ہوتی ہوئی کہنے لگیں ۔

ساجد اور صابرہ خاتون ان ہی باتوں میں مصروف تھے کہ شاکر ، انجم اور نائلہ تینوں اندر داخل ہوئے ۔ ساتھ پپو اور منی بھی تھے ۔ گھر پر صرف رحیمن بوا ہی رہ گئی تھیں سب نے باری باری انہیں سلام کیا تو صابرہ خاتون سب ہی کو دعاؤں سے نوازنے لگیں پھر جیسے ہی ان کی نگاہ نائلہ پر پڑی ان کے چہرے پر ایک چمک سی

آ گئی۔ انہوں نے بڑی محبت سے اسے مخاطب کیا۔ نائلہ بیٹی کیسی ہو۔"

"بس دعائیں ہیں آپ کی اور اللہ کا فضل و کرم ہے آپ کہیے اب آپ کی طبعیت کیسی ہے پھوپھی ماں۔" نائلہ نے بڑے ادب و احترام سے پوچھا۔

اب ٹھیک ہوں بیٹی۔ اللہ نے کرم کر دیا طبعیت کچھ ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی ہے لگتا ہے مالک نے کچھ مہلت عطا کر دی کہ کچھ اور ذمہ داریاں جو بچ گئی ہیں پورا کر لوں۔ انہوں نے معنی خیز اور میٹھی نظروں سے نائلہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو نجانے کیوں وہ جھینپ سی گئی اور ان کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ دوسری جانب ساجد کی نظریں بھی اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں وہ بھی دل ہی دل میں پروانہ وار اس پر نثار ہو رہے تھے۔ پھر فوراً ہی انہوں نے اپنی نظریں اس کے سراپے سے ہٹالیں مبادا کوئی دیکھ نہ لے۔ پپو دادی ماں کے قریب بیٹھا ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے انہیں چوم رہا تھا اور منی انجم کے پاس بیٹھی تھی وہ سب ملنے کے اوقات ختم ہونے تک وہاں بیٹھے رہے۔

صابرہ خاتون کی صحت جب کچھ سنبھل گئی اور انجم کو کسی قدر راحت ملی تو نائلہ نے اپنی بہن سے اجازت چاہی۔ "انجم اب اگر تم اجازت دو تو میں واپس اپنے گھر چلی جاؤں پورے دس دن ہو چکے ہیں مجھے گھر چھوڑے ہوئے پتہ نہیں کیا حال ہو۔ اس عرصہ میں وہاں جا ہی نہ سکی ہو سکتا ہے کہ شاہد کا کوئی خط ہی آیا ہو۔ ممکن ہے اسے کسی چیز کی ضرورت ہو پیسے وغیرہ درکار ہوں۔" نائلہ چھوٹے بھائی شاہد کے لیے فکر مند ہوتی ہوئی کہنے لگی۔ وہ نائلہ اور انجم کا اکلوتا... بھائی تھا اور بنگلور میں انجنیئرنگ پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی بڑی بہن نائلہ کی ہدایت کے مطابق ہر ہفتہ اسے ایک خط تحریر کرتا اور اپنی تعلیمی مصروفیات اور کبھی کبھی اپنی ضروریات سے بھی آگاہ کرتا۔ نائلہ شاہد کے لیے فکر مند ہو کر انجم سے اپنے گھر جو کہ حیدر آباد کے ریڈ ہلز ایریا میں تھا واپس جانے کی اجازت چاہ رہی تھی اور پھر اس کی چھٹیاں بھی اب ختم

ہو رہی تھیں آئندہ ہفتہ کالج کھل رہے تھے وہ گرلز جونیر کالج میں لکچرر تھی۔

" ٹھیک ہے باجی۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں لیکن آج ایک دن اور ٹھہر جائیے کل صبح ضرور چلی جائیں۔ شاکر آجائیں تو ان سے بھی بات ہو جائے گی۔ ویسے بھی اب مما کی طبیعت بہت بہتر ہے۔ دو ایک دن کے بعد شاید وہ ڈسچارج بھی ہو جائیں۔"۔ انجم نے اپنی بہن کو روکنا چاہا۔

جیسی تمہاری خوشی۔ آج ضرور رک جاؤں گی لیکن کل صبح ضرور چلی جاؤں گی۔ نائلہ نے کہا۔ اور اپنے کمرے کی جانب چلی گئی جو اس کے قیام کے لیے دیا گیا تھا۔

نائلہ اور انجم دونوں بڑی اور چھوٹی بہنیں تھیں۔ اور شاہد ان دونوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بد قسمتی سے والدین دونوں ہی باری باری اس جہان فانی سے گزر گئے تھے۔ سب سے پہلے والد سراج احمد صاحب کا جو کہ محکمہ تعلیمات سے وابستہ تھے انتقال ہوا تھا اس وقت نائلہ بی ایس سی کے آخری سال کی طالبہ تھی۔ پھر جیسے ہی اس نے گریجویشن پاس کر لیا۔ اسے اس کے والد کی جگہ ملازمت مل گئی اس نے پیشہ تدریس کو منتخب کیا تو اسے گرلز ہائی اسکول پر پوسٹ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی محنت اور لگن سے لڑکیوں میں اپنا ایک منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہو گئی اور ایک مقبول استادنی کہلائی جانے لگی ملازمت کے دوران ہی اس نے بی ایڈ کر لیا۔ گھر کے اخراجات اور انجم و شاہد کے خرچ کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر آپڑا تھا لیکن وہ ایک باہمت لڑکی تھی۔ مایوس ہونا اس نے سیکھا ہی نہ تھا ہر طرح کے مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی۔ انہی دنوں انجم کے لیے شاکر کا رشتہ آیا تو اپنے چند قریبی رشتہ داروں اور مخلصوں کی مدد اور تعاون سے اس نے بعد تحقیقات یہ رشتہ منظور کر لیا۔ ماں نے لاکھ سمجھایا کہ پہلے اس کی اپنی شادی ہونی چاہیئے لیکن نائلہ نہ مانی تو اس کی ضد کے آگے انہوں نے خاموشی اختیار کی اور انجم کے لیے شاکر کا رشتہ

منظور کر لیا ۔ پھر بڑی سادگی سے شادی انجام پا گئی ابھی انجم کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہ چھوٹی تھی کہ ایک دن نائلہ کی امی نجمہ بیگم عشاء کی نماز کے بعد جو سوئیں تو وہی نیند ابدی ثابت ہوئی ۔

ڈاکٹروں نے صبح معائنے کے بعد بتایا کہ حرکت قلب بند ہونے سے رات ہی کے کسی حصے میں انتقال ہو چکا تھا ۔ نائلہ انجم اور شاکر پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ۔ نائلہ اب تنہا رہ گئی تھی ۔ شاہد چونکہ ابھی بہت چھوٹا تھا اور انٹر میڈیٹ کا طالب علم تھا لہذا نائلہ کو اپنے آنسو روک کر بہن اور بھائی کے آنسو پونچھنے پڑے ۔ اس نے انہیں اللہ کی مرضی کے آگے صبر کرنے کی تلقین کی خود تو تھی ہی صابر اور بہادر اس نے بھی خالق کائنات کی مرضی کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر لیا اور صابر وشاکر ہو گئی وقت جیسا کہ ہر زخم کا مرہم کہلاتا ہے گزرتا گیا ۔ نائلہ ، انجم اور شاہد کے زخم بھی بھرتے گئے ...... اور وہ گردش کائنات میں گم ہوتے گئے ۔ شاہد جب انٹر میڈیٹ امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو گیا تو نائلہ نے اسے انجینیرنگ کی ڈگری کورس میں داخلہ دلوادیا ۔ اور اب وہ بنگلور سے انجینیرنگ پڑھ رہا تھا ۔ ان سب فرائض کی تکمیل میں نائلہ نے خود کو جیسے بھلا ڈالا ۔ اپنے سارے جذبات واحساسات کو تھپک تھپک کر سلادیا اور اپنی عمر عزیز کے ستائیس سال ان فرائض کی تکمیل کی بھینٹ چڑھادیئے اس کا نازک اور کومل چہرہ اب پختہ ہو چلا تھا لیکن چونکہ اس کے بدن کی ساخت کچھ ایسی تھی اسے دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا ۔ جب اس کے متعلق یہ ساری تفصیل شاکر نے اپنے بڑے بھائی ساجد کو بتائی تو وہ دل ہی دل میں نائلہ کی قربانی اور ایثار کے قائل ہو گئے اور داد دیے بغیر نہ رہ سکے ۔ اس باہمت اور بلند کردار لڑکی پر مرمٹے اور دل ہی دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی اور انہوں نے اسکے حق میں فیصلہ دے دیا اور اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود تنہائی میں اس سے گفتگو کریں گے اور اپنی درخواست پیش

کریں گے کہ وہ ان کی ویران زندگی میں بہار بن کر چلی آئے۔

صابرہ خاتون جب صحتیاب ہو کر گھر لوٹیں تو ساجد کی خواہش پر ان کی صحتیابی کی خوشی میں ایک مختصر سی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ان کے بنگلے کو جو کہ بنجارہ ہلز روڈ نمبر ۲ پر واقع تھا کسی خوبصورت دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رنگ برنگی روشنیوں سے ساری عمارت جگمگا رہی تھی۔ سارے عزیز واقارب دوست احباب اور مخلصین اس جشن صحت میں مدعو تھے۔ رنگین ریشمی آنچلیں لہرا رہے تھے اور قہقہوں کی آوازوں سے صابرہ منزل، گونج رہی تھی۔ ساجد نے دیکھا ان تمام ہنگاموں سے دور نائلہ انتظامات کی نگرانی میں مصروف تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی کامدانی ساڑی میں وہ بہت جچ رہی تھی اس لباس میں اس کا سنجیدہ حسن کچھ اور نکھر آیا تھا۔ وہ بہت کم ہنس رہی تھی۔ بس ایک ہلکا سا تبسم اس کے دبیز سرخ ہونٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔ ساجد اس حسن سنجیدہ پر جیسے قربان ہوئے جا رہے تھے۔ اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ اس میں بے انتہا برد باری ہے۔ اس کے مزاج ہی میں سنجیدگی اور نفاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ کبھی کسی سے بے تکلف ہو کر بات نہ کرتی۔ رات دیر گئے جب دعوت اختتام کو پہنچی اور جب صابرہ خاتون کو ان کی صحتیابی کے لیے گلپوشی کی گئی تو انہوں نے جذباتی ہو کر اپنے دونوں لڑکے اور انجم کو گلے لگا لیا اور دعاؤں سے نوازنے لگیں یہ جذباتی منظر دیکھ کر ہر ایک کی آنکھیں نم ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

ایک دن جب اچانک ہی نائلہ کے گھر کال بیل کی آواز فضا میں تحلیل ہونے لگی تو نائلہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ساجد کھڑے تھے اور جب نائلہ نے انھیں اندر آنے کے لئے کہا تو وہ اندر داخل ہو کر ڈرائینگ روم میں نفاست سے سجائے گئے صوفہ پر براجمان ہو گئے " میں ابھی آئی آپ تشریف رکھیں اور اس رسالہ کا مطالعہ کریں۔

اس نے هما اردو ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا اور اندر کچن کی جانب چلی گئی۔ جلدی جلدی اس نے کچھ سینڈوچ انڈوں کو پھینٹا کر تیار کیے اور ٹرے میں سجا کر چائے کے ساتھ لے آئی۔ پھر خود بھی ان کے مقابل والے صوفہ پر خود کو سمیٹے ہوئے بیٹھ گئی۔

"لیجئیے یہ سینڈوچ۔ جلدی میں بنالائی ہوں پتہ نہیں کیسے بنے ہوں گے۔" اس نے سینڈوچ کی پلیٹ ساجد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے خوامخواہ ہی تکلیف کر ڈالی میں ابھی گھر سے ناشتہ کر کے ہی نکلا تھا ساجد نے ایک سینڈوچ لے لیا پھر وہ دونوں چائے سے لطف اندوز ہونے لگے چائے سپ کرتے ہوئے نائلہ نے پوچھا۔

"پھوپی امی کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"اب تو اللہ کا فضل ہے وہ بہت ہشاش ہو گئی ہیں لیکن اب روز ان کا ایک ہی اصرار ہے کہ میں بھی اب شادی کر لوں اور گھر بار کا ہوجاؤں۔" ساجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ان کا مطالبہ ناجائز تو نہیں۔ وہ ماں ہیں اور چاہتی ہیں کہ اپنے چھوٹے بیٹے شاکر کی طرح آپ بھی ازدواجی زندگی کی خوشیاں سمیٹیں۔ اس عمر میں بے چاری اور کیا چاہیں گی اور پھر اس میں آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ نائلہ نے صابرہ خاتون کی حمایت میں اپنائیت کے ساتھ کہا۔

"ہاں میں بھی اب یہی چاہتا ہوں کہ مما کی اس دیرینہ خواہش اور آرزو کو پورا کر دوں لیکن....." اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن کیا.....! کوئی خاص مسئلہ درپیش ہو تو بتائیے میں اگر آپ کے کام آسکوں تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔" نائلہ نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"دراصل ایک لڑکی مجھے بہت بھا گئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ شادی اسی

سے کروں ورنہ نہیں ۔ لیکن ... ڈر رہا ہوں کہ یہ جان کر وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی کیا فیصلہ کرے گی ۔" ساجد نے پریشانی سے کہا۔

" کون ہے وہ لڑکی ۔ آپ مما سے کہہ سکتے ہیں ۔ انجم کو بتا سکتے ہیں یا پھر آپ مجھے اپنا سمجھتے ہوں تو مجھے بتائیے میں راضی کر لونگی اسے ۔" نائلہ نے انہیں پریشان دیکھ کر کہا۔

" نائلہ صاحبہ .... میں آپ کو اپنا سمجھ کر ہی آپ کے پاس اپنے دل کی بات کہنے آیا ہوں دراصل میں چاہتا ہوں کہ میں خود اس لڑکی سے بات کروں اور اس کی رائے اپنے بارے میں معلوم کروں ۔ اگر وہ راضی ہو جائے تب مما کو بتاؤں گا ۔"

تو پھر کہیئے نا کون ہے وہ جس نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کرنا نہیں چاہتے ۔"

" وہ لڑکی جس نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میرے تصورات پر قابض ہو گئی اس نے میرے دل کے بند دروازے پر اس شدت سے دستک دی کہ میں نے سارے کواڑ ایک ساتھ کھول دیے اور ہر دریچہ دل سے وہ دبے قدموں میرے دل کے سنگھاسن پر آ بیٹھی وہ اتنی معصوم اتنی پاکیزہ ہے کہ اس پر مجھے ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوں آپ نے مما کی صحتیابی کے جشن میں اسے دیکھا ہو گا ۔ ہلکے آسمانی رنگ کے ماربل شفان کی کامدار ساڑی میں آسمانی حور سے کم دکھائی نہ دیتی تھی وہ ۔ اس کے حسن سادہ پر میں لاجواب ہو گیا ۔ ساجد نے اسے پریشان کر دیا ۔" اس تقریب میں آسمانی ساڑی میں حسن سادہ ۔!" میں کچھ سمجھی نہیں ۔ نائلہ نے اپنی سوچ میں گم ہوتے ہوئے تصور ہی تصور میں اس حسن سادہ کو تلاش کرنے لگی بالآخر ناکام ہو کر ساجد سے پوچھنے لگی ۔

" یہ آپ پہیلیاں نہ بجھوایئے صاف صاف بتایئے کہ کون ہے وہ ۔"

" وہ لڑکی کوئی اور نہیں وہ آپ ہیں نائلہ خدارا مجھے مایوس نہ لوٹایئے بڑی

آرزوئیں اور تمنائیں لیے میں نے آپ کے در پر دستک دی ہے، ساجد بڑی عاجزی سے کہنے لگے۔

" نائلہ نے سنا تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اسے ساجد کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ساجد صاحب اس کے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہیں۔ اس نے تو اپنے دل کے کواڑ کبھی کے مقفل کر دیے تھے کہ اس پر دستک دینے والا کوئی آئے ہی نہیں لیکن یہ آج ساجد صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ دستک دے بیٹھے وہ حیران نظروں سے انہیں تکنے لگی اس کی زبان گنگ ہو چلی تھی جیسے ابھی ابھی اسے فالج ہو گیا ہو۔ وہ بس چشم پر نم لیے انہیں تکنے لگی زبان سے ایک لفظ بھی کہنا اس کے لیے مشکل لگ رہا تھا اس کے دل نے کہا۔

" پگلی اتنے ارمانوں سے کوئی تجھے اپنانے آیا ہے تیری دیرپا آرزوؤں کی تکمیل کا وقت اب آگیا ہے تیری تمنائیں اب پوری ہونے کو ہیں اور کوئی اپنا آپ تجھ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ تیری قربانیاں، تیرا ایثار آج رنگ لانے کو ہے تو کیا سوچ رہی ہے۔ ہاں کہہ دے۔" اس کے دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ " نائلہ تیرا چھوٹا بھائی جسے اپنی تعلیم مکمل کرنے کو ابھی دو سال اور باقی ہیں۔ کیا کہے گا وہ۔ بیچ منجدھار میں اس کی کشتی چھوڑ کر چلی جائے گی تو کیا یہی تیرا ایثار اور یہی تیری قربانی ہے۔ کیا سوچے گا وہ جس کے لیے تو ہی سب کچھ ہے۔ ماں ہے باپ ہے بھائی اور بڑی بہن۔" اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی دل اور دماغ میں سرد جنگ جاری تھی اور وہ گم صم سی آنکھیں پھیلائے سوچ کے گہرے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ ساجد نے کہا۔

" کہیئے نائلہ صاحبہ کیا جواب ہے آپ کا۔ دیکھیئے اس نامراد کو خالی ہاتھ نہ لوٹایئے۔"

"ساجد صاحب جس کی اپنی جھولی خالی ہو وہ بھلا دوسروں کو کیا دے سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں میرے سر پر شاہد کی تعلیم کا بوجھ ہے...وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے جب تک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے میں بھلا اپنے بارے میں کیوں کر سوچ سکتی ہوں۔ ویسے بھی اب شاید کافی دیر ہو چکی ہے۔" نائلہ نے شاہد کی ذمہ داری کی آڑ لے کر اپنا دامن بچانا چاہا۔

"کیا شادی کے بعد یہ ذمہ داری ہم دونوں کی نہیں ہو سکتی۔ آپ سے میرا یہ وعدہ رہا کہ شادی کے بعد آپ کو کسی قسم کی شکایت نہیں رہے گی۔ میں ایک مکمل ہم سفر و شریک حیات ثابت ہونے کی کوشش کروں گا ایسا شریک سفر جس کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے۔" ساجد نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دیجیئے گا۔" نائلہ نے ان کا دل توڑنا نہ چاہا اور ٹالتے ہوئے کہا۔

"جیسا آپ مناسب جانیں لیکن یاد رکھیئے کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے کام ضرور آئیں گی اور اس لڑکی کو شادی کے لیے رضامند کریں گی جسے میں پسند کرتا ہوں ساجد یہ کہتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر پروقار مسکراہٹ سجائے چلے گئے اور نائلہ کو سوچوں میں غرق کر گئے۔ یا خدا میری کشتی حیات کو یہ کس منجدھار میں تو نے پھنسا ڈالا۔ سوئی ہوئی تمام آرزوں اور تمناؤں کو پھر سے جگانے کی کوشش کر ڈالی وہ سجدہ ریز ہو کر اپنے مالک حقیقی سے دعا مانگنے لگی کہ اسے راہ مستقیم دکھائے۔ یا اللہ تو ہی مجھے اس طوفان سے باہر نکالنے والا ہے مجھے راستہ دکھا کہ میں کیا کروں۔

دوسرے دن اچانک ہی صابرہ خاتون انجم اور شاکر آدھمکے وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ صابرہ خاتون نے خوبصورت سرخ اوڑھنی اس کے سر پر ڈالی اور ایک خوبصورت ہیرے کی انگوٹھی اس کی نازک انگلی میں پہنادی اور کہا۔ "بیٹی

ایک ماں کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا وقت آیا ہے میرے بیٹے نے مدتوں بعد بڑی آرزوؤں اور تمناؤں سے سر پر سہرا سجانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے اور اس کی پسند اتنی اعلیٰ وارفع ہو گی میں کبھی جان نہ پائی۔ تم وہ ہیرا ہو جسے صرف جوہری ہی پرکھ سکتا ہے۔ میں نے بھی یہی خواہش اپنے دل میں کر رکھی تھی کہ کاش میں تمہیں اپنی بیٹی بنا پاتی۔ اللہ پاک نے شاید تمہیں میرے ساجد کے لیے ہی بنایا ہے اسی لیے شاید تم نے ابھی تک شادی نہیں کی اس رب پاک کی مصلحت وہی جانے۔" انہوں نے اس کی چمکتی ہوئی جبیں پر اپنی مہر محبت ثبت کرتے ہوئے کہا اور اپنے سینے سے لگالیا تو وہ شرم سے نہا گئی۔ نظریں جھکی جھکی رہیں وہ اپنا سر بھی نہ اٹھا سکی۔

ایک مبارک ساعت وہ دلہن بنی ساجد کے ویرانے کو اپنی محبت کی خوشبوؤں سے معطر کرنے چلی آئی۔ ساجد نے اسے اتنی محبت دی کہ وہ نہال نہال ہو گئی۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار موسم دیکھے تھے۔ لیکن کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی زندگی میں بہاروں کا موسم بھی آئے گا۔ سابد ایک پر بہار شخصیت کا نام ہے۔ زندگی کے صحرا میں حالات کی تپتی ہوئی دھوپ سے گزر کر اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ساجد جیسا سائبان بھی اسے مل سکتا ہے۔۔ وہ ایک مکمل سایہ دار درخت کے مانند تھے۔

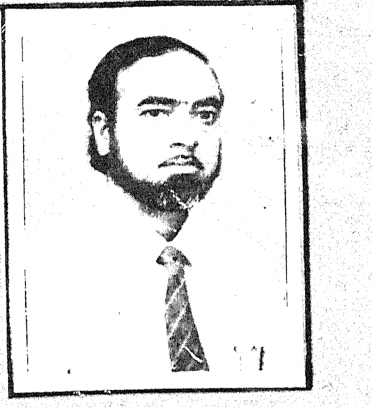

نام: محمد انیس فاروقی

تاریخ پیدائش: یکم جون ۱۹۵۳ء

وطن: نظام آباد

تعلیم: ڈپلوما اِن سِوِل انجنیرنگ

عہدہ: ڈپٹی زونل انجنیر،

انڈسٹریل انفرا اسٹرکچر کارپوریشن لمیٹیڈ حیدرآباد۔

پتہ: "نورجبیں"

۸۲ / ۶۱ - ۴ - ۹، معراج کالونی،

ٹولی چوکی، حیدرآباد - ۸